ماہنامہ

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

جلد: ۵۱ | خواجہ ثناءاللہ بٹ نمبر | شمارہ: ۱۱-۱۲

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
کمپیوٹر کمپوزنگ: بشارت احمد بابا
قیمت: ۵۰ روپے

☆......خط وکتابت کا پتہ:
مدیر اعلیٰ "شیرازہ" اردو
جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز
سرینگر / جموں

فہرست



B

حرفِ آغاز

قانونِ قدرت ہے کہ اس کارگہہ سود وزیاں میں وہی شخص حقیقی معنوں میں کامیابی اور کامرانی کے میدان کا شہسوار ہے جو اپنی ذہانت ، فطانت ، حوصلے اور جودتِ طبع جیسی اعلیٰ خصوصیات کی رہنمائی میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہتا ہے اور جب یہ صفات محنت اور مشقت کے ساتھ یکجا ہوجاتی ہیں تب کہیں جا کر قابلِ قدر اور معتبر شخصیات معرضِ وجود میں آتی ہے۔ زمانہ ایسے اشخاص کو دور بلکہ بہت دُور سے پہچان لیتا ہے۔ خواہ ان کا تعلق فن سے ہو کہ سیاست سے، ادب سے ہو یا زندگی کے کسی اور شعبے سے...... ان کی صلاحیتوں کا ڈنکا چہار سو بجتا ہے لیکن ایسے لوگ برسوں میں پروان چڑھتے ہیں اور زمانے کے لئے مثال قائم کر جاتے ہیں۔ ایسی ہی شخصیات میں اعلیٰ صفات کے حامل صحافی خواجہ ثناء اللہ بٹ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ خواجہ صاحب ان یکتائے روزگار اشخاص میں سے تھے جنہوں نے وقت اور حالات کے تھپیڑوں کو نہایت حوصلے اور جرأت مندی سے جھیل کر اپنے اندر موجود اعلیٰ خصوصیات کو کبھی متاثر نہیں ہونے دیا اور دُنیائے صحافت میں نام کر گئے۔ اُنہوں نے اپنے دھار دار قلم سے میدانِ صحافت کو ایسا اعتبار اور افتخار بخشا کہ ریاست کے صحافتی منظر نامے پر اَنمٹ نقوش رقم کر گئے ۔

وُسعتیں مجھ کو خلاؤں کی بھلا روکیں گی کیا

حوصلے بے انتہا اور آسماں ہیں سات ! بس

اِس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ادب میں جب تک ادیب کی شخصیت اور کارناموں کا بہ نظر غائر مطالعہ نہ کرلیا جائے اور اِس بارے میں تمام معلومات بہم نہ پہنچائی جائیں تو اس کے بارے میں صحیح اور بے لاگ رائے بھی قائم نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلمکار کی شخصیت اس کے

زورِ قلم سے جھلکتی ہے۔ صحافت کو جلدی میں تخلیق کیا جانے والا ادب بتایا گیا ہے اب جبکہ خواجہ ثناء اللہ بٹ کو مطالعے کا موضوع بنایا گیا ہے تو اُن کی جدوجہد، مشاہدے، مطالعے، تجربات اور کارناموں کا بھرپور احاطہ کرنا ہوگا۔

خواجہ صاحب نصف صدی سے زائد عرصے تک کشمیر کے صحافتی منظر نامے پر چھائے رہے۔ اتنا ہی نہیں اِس شعبے میں بعض نئی چیزیں متعارف کرانے اور انہیں استحکام بخشنے کا طرۂ امتیاز بھی انہیں حاصل ہے۔ اُنہوں نے لالچ، خوف، سودوزیاں اور ذاتی عیش وآرام کی پرواکئے بغیر ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈال دی جس کے آبِ ظلال سے نہ صرف ہزاروں تشنگان نے اَپنی پیاس بجھائی بلکہ اِس وقت بھی یہاں کے ادبی اور صحافتی منظر نامے پر جو خوشنما پھول نظر آرہے ہیں اُن کو سجانے سنوارنے اور ان کی پرداخت میں خواجہ صاحب کے رول کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کے بیشتر صحافیوں اور قلمکاروں کی ابتدائی تربیت گاہ خواجہ صاحب کا مؤقر روزنامہ ''آفتاب'' ہی رہا ہے۔

راقم الحروف بھی اُن خوش نصیبوں میں سے ہے جسے قریب ایک دہائی تک اس تربیت گاہ سے فیضان حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا، اس لئے راقم اِس تربیت گاہ کے بعض مراحل کا نہ صرف عینی شاہد رہا ہے بلکہ خواجہ صاحب سے بالمشافہ گفتگو اور ان کے ارشادات واحکامات بجالانے کی سعادت بھی ملی ہے۔ خواجہ صاحب ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے تھے۔ اکثر کام کاج کے دوران اپنے تجربات بیان کرتے رہتے۔ اُن کا حافظہ غضب کا تھا۔ برس ہا برس پہلے رونما حالات وواقعات اُن کے ذہن میں بالکل محفوظ ہوتے تھے، جیسے وہ ابھی ابھی وقوع پذیر ہوئے ہوں۔ زمانے کے سرد وگرم کے باوجود اُنہوں نے صحافت میں ایسا جاندار اور شاندار اَنداز اختیار کیا کہ اِس سے قبل ایسی مثالیں بہت کم دیکھنے کو مِلتی ہیں۔ پچیس، تیس برس قبل اُنہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھنا چھوڑ دیا تھا اور ڈکٹیشن دینے لگے تھے۔ اِس میں اتنی روانی ہوتی تھی کہ الفاظ اُن کے حکم کے تابع رہتے تھے اور وہ انہیں جس طرح اور جس رنگ میں چاہتے، سجانے پر قدرت رکھتے تھے۔ ایک ہی نشست میں طنز ومزاح کے کالم، اُسی نشست میں ایڈیٹوریل

جیسی سنجیدہ تحریر اور اُسی نشست میں خبریں اور Exclusive Stories۔ مزے کی بات یہ ہوتی تھی کہ سامنے اُن کے پاس باقاعدگی سے آنے والے دوستوں، عزیزوں اور گاہے گاہے مہمانوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ یہ اُن کی تخیل آفرینی کا کمال تھا کہ وہ دوسرے روز جب قاری کے ہاتھوں میں اخبار ہوتا تو بیک وقت وہ ہنسنے پر بھی مجبور ہو جاتا اور سنجیدہ غور وفکر کے لئے بھی اپنے آپ کو بے بس پاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ قاری کسی طلسماتی فضا میں مسحور ہو کے رہ گیا ہے۔ بقولِ انیسؔ

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

خواجہ صاحب ایک حساس اور دردمند شخص تھے جو تمام عمر سماجی و معاشرتی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں سے نبرد آزما رہے۔ اُن کا ایقان تھا کہ سماجی بُرائیوں اور بوالعجبیوں پر کچھ اس طرح طنز کے تیر چلائے جائیں کہ اِس میں اصلاح کا پہلو نکل آئے۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے کبھی تو اُنہوں نے جارحانہ انداز اختیار کیا اور کبھی اپنی تحریروں کو مزاح کی چاشنی میں ڈبویا۔

دورانِ گفتگو خواجہ صاحب نے بارہا اِس حقیقت کا اظہار کیا کہ جب اُنہوں نے ''آفتاب'' شروع کیا اُن کو اِس کی ادارت، بسا اوقات کتابت، دفتری کام کاج اور اِس کی دسٹری بیوشن میں بھی اپنے دستِ شوق سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اُن کے پاس اس کام کے لئے بیسیوں کارکن تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اُنہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ لوگ خرید کر اخبار پڑھیں اور یہ ان کی عادتوں میں شامل ہو جائے۔ خواجہ صاحب نے اِس بات کا التزام کیا کہ ''آفتاب'' نہ صرف معنوی اعتبار سے خوب ہو بلکہ یہ صوری اعتبار سے بھی خوب تر ہو۔ اِس مقصد کے لئے نہ صرف ریاست کے اعلیٰ پایۂ خطاطوں اور خوشنویسوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں بلکہ ریاست سے باہر بھی خوشنویسوں کو اچھا خاصا حق المحنت اُدا کیا جاتا تھا۔ آفتاب، کشمیر کی روایتی خوشنویسی کا اعلیٰ نمونہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اپنے دفتر میں سب سے پہلے ٹیلی پرنٹر لگوایا اور آج سے تقریباً چار دہائیاں قبل یہ ایک بہت بڑی حصولیابی تھی جس نے یہاں صحافت کے معیار کو بہت اونچا کر دیا۔ خواجہ صاحب نے کشمیر میں سب سے پہلے آفسیٹ پرنٹنگ متعارف

کرائی۔ یہ جرأت رندانہ بھی اخبار نویسی کے شعبے میں ایک بہت بڑی ابتداء تھی جس کے نہایت ہی دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ آفتاب میں خصوصی ایڈیشن اور ضمیمے متعارف کرانے میں خواجہ صاحب کی پہل کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ سنڈے ایڈیشن، ادبی ایڈیشن، بچوں کا ایڈیشن، خواتین ایڈیشن، جمعہ ایڈیشن، عید ایڈیشن، میلاد ایڈیشن، حج ایڈیشن، بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاسکتے ہیں۔

بہر حال، یہ سلسلہ بہت طویل ہے اور اسے محدود الفاظ میں سمیٹنا بہت مشکل!

خورشید ہوں میں اپنی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

صحافت کی دُنیا میں انمٹ نقوش رقم کرنے والی اِس شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے شیرازہ کی یہ خصوصی اشاعت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ خواجہ صاحب کی حیات اور کارناموں پر بہت خامہ فرسائی ہوگی اور ہماری یہ پرخلوص کوشش اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اس کینواس میں کئی اور رنگ بھرے جاسکتے تھے لیکن ہمارے ہاں بعض کرم فرماؤں نے یہ کوشش شاید آنے والے کل کے لئے سنبھال کے رکھی ہوئی ہے اور ہم وعدۂ فردا کے وفا ہونے کا زیادہ اِنتظار نہیں کرسکتے۔ ادارہ اُن مضمون نگاروں کا بے حد ممنون ہے جنہوں نے ہماری گزارش پر اپنی تحریریں ہمیں ارسال کیں جن سے ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ یہ ہماری پرخلوص کوشش ہے اور اِس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ ہمارے قارئین محترم کے ہاتھوں میں ہے اور ہمیں آپ کی آراء کا اِنتظار رہے گا۔

☆ ...... محمد اشرف ٹاک

...........●●●...........

☆......محمد یوسف ٹینگ

خواجہ ثناء اللہ آفتاب
کشمیر کی اُردو صحافت کا نقیب

خواجہ ثناء اللہ بٹ سے میں معاصر کشمیر کے ایک جدت طراز صحافی کی حیثیت کے مداح کی طرح ملا۔ لیکن پھر یہ تعلق پہلے دوستی، پھر پڑوسی پن اور پھر یگانگت میں تبدیل ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری زندگی کی ایک پوری دہائی اسی آفتاب کی روشنی سے روشن رہی اور اسی کے حوالے سے جانی پہچانی جا سکتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات کہ اُن کے ہی دستِ سخا اور نفسِ شفاء سے میں آج تک اس سرائے فانی میں سانس لے رہا ہوں ورنہ فروری ۱۹۶۵ء کی ایک خنک دوپہر میں میرا کام تمام ہو گیا تھا۔ اس حادثے کی تفصیل ذرا بعد میں۔

خواجہ صاحب کیسے ۱۹۵۷ء میں سرزمینِ پاکستان سے کسی ویزا پاسپورٹ وغیرہ کے بغیر سرینگر وارد کئے گئے۔ اُس کی روداد میرے علاوہ بہت سے دوسرے خواجہ شناس بھی لکھ چکے ہیں۔ اس لئے میں اُن کی معارف پروری اور صحافت نقیبی سے بات شروع کرتا ہوں۔ مہاراجہ ہری سنگھ کے راج میں کشمیر میں اُردو صحافت کا باغ پرورش پانے اور لہلہانے لگا۔ اُس دور کے ہمدرد، خدمت، دیش، خالد، اِصلاح، روشنی اور بہت سے اخبار اپنے وقت کی بہترین اخباری روایات کے ترجمان تھے۔ اِن میں بعض اخبار امتدادِ زمانہ کی آفات و واردات جھیل کر آج بھی ہماری صحافت کی پارینہ سالی اور بزرگی کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں عوامی راج کے شروع ہونے پر صحافت اور صداقت کے ایسے بہت سے چراغ نئی تبدیلی کی آندھیوں سے بجھ گئے۔ اِن میں پنڈت پریم ناتھ بزاز کا ہمدرد جیسا صحیفہ بھی شامل تھا جسے اپنے

وقت کا مکمل اخبار Complete News Paper قرار دیا جاسکتا تھا۔ صحافت کے علاوہ مزاح، شعروادب، بحث ومباحثہ (Discourse) وغیرہ سبھی سے آراستہ۔ عوامی حکومت کا مزاج بہت نازک ثابت ہوا۔ اُس نے گفتگو کے بہت سے سُروں کو صرف توصیف وتعریف کا آہنگ بخشنے کا انتظام کیا۔ ۱۹۵۳ء کے شب خون کے بعد کے حکمرانوں کو بھی یہ موسم بہت راس آیا اور مغلوب و معتوب وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ صاحب کے حق میں ریاست کی سرزمین سے ایک کمزور سی آواز جموں کے ایک اخبار ہفتہ وار ''سچ'' کو بلند کرنا پڑی۔ ورنہ ایسا لگتا ہے کہ اس نام کا کوئی رہنما ریاست میں موجود ہی نہیں ہے۔ مخالفوں کو بے وجود Non-Person بنانے کا یہ کالا ہُنر اُس وقت کے سوویت روس میں کمال کو پہنچا دیا گیا تھا اور ۱۹۵۳ء میں مسلط کی گئی سرکاری ٹولی میں وہاں سے اِکتساب کرنے والے بہت سے نام نہاد ہم سفر Fellow Travellers بہت شور مچاتے نظر آتے تھے۔

نہ معلوم ۱۹۵۵ء کے قریب ایک مقامی صحافی غلام رسول عارف صاحب نے کس طرح اپنے ہفتہ وار ہمدرد کے لئے ڈیکلریشن حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ عارف صاحب کبھی روزنامہ ''خدمت'' میں نائب مدیر وخوشنویس وغیرہ حیثیتوں سے کام کرچکے تھے اور اُنہیں صحافت کا چسکہ لگا ہوا تھا۔ اِس ہفتہ وار کی ایک جرأتِ رندانہ یہ تھی کہ اس نے کئی برسوں کے بعد شیخ عبداللہ صاحب کی تصویر شائع کی۔ قارئین کو ایسے لگا کہ گلریز کا عجب ملک پھر کشمیر کی نوش لب سے مکالمہ کرنے کے لئے کسی کوہِ قاف سے واپس آگیا ہے۔ اس میں بہت دھیمی آواز میں کبھی کبھی شیخ صاحب کی کسی تقریر وغیرہ کی کرنیں بھی چمکتی تھیں ورنہ دوسرے اخبار صرف سرکاری نوبت خانے کے نقاروں کی بے ہنگم اور شر رآمیز آوازوں سے گونجتے رہتے تھے۔

ایسے گھپ اندھیرے کا احساس اُس وقت اور زیادہ ہوگیا جب ۱۹۵۸ء کے موسمِ بہار میں کوکر بازار سرینگر سے ایک ہفتہ روزہ ''آفتاب'' کے نام سے منظرعام پر طلوع ہونے لگا۔ اس کا اُبھار بہت دھیما دھیما رہا کہ یہ خود اُس وقت کی Establishment کی نگرانی نظر میں چھپتا تھا۔ لیکن اِس کا گیٹ اپ، اس کا رکھ رکھاؤ، سُرخیوں کا تیکھاپن اور عبارتوں کی گہرائی بتا رہی تھی کہ ۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

خواجہ صاحب کو اپنی عزت نفس کا اِتنا خیال تھا کہ کشمیر کی روایت کے برعکس اُنہوں نے روز اوّل سے ہی خواجہ کو اپنے نام کا حصہ بنایا اور آفتاب کی پرنٹ لائن پر یہی نام چھپتا رہا حالانکہ اِس سے کچھ بد باطنوں کو کوفت بھی ہوتی رہی۔ بات دراصل یہ تھی کہ ۱۹۵۸ء تک شیخ صاحب کی نظر بندی کو پانچ سال گزر چکے تھے۔ اُن پر کوئی مقدمہ دائر نہیں تھا اور نہ کوئی چارج شیٹ عائد ہوا تھا۔ ساری دُنیا میں اِس زور زبردستی کے خلاف ماتھوں پر تیوریاں پڑ رہی تھیں اور اُس وقت کے وزیرِ اعظم ہند جواہر لال نہرو کو نئی دنیا کی رہنمائی کرنے کی تمنا کرنے میں حائل ہو رہی تھیں۔ اِس لئے شیخ صاحب کی رہائی کے لئے دلّی سے تاریں ملائی جارہی تھیں۔ مقامی گماشتے اِس فرمان کی عدولی تو نہیں کر سکتے تھے لیکن اس کے مقصد کو گہنا دینے اور بھٹکانے کے لئے اپنی چالبازیاں تو چلا سکتے تھے۔ چنانچہ اس میں ایک چال یہ تھی کہ ایک پورا اخبار مہمِ شیخی کا تدارک کرنے کے لئے نکالا جائے پورے اہتمام اور احتشام کے ساتھ۔ خواجہ ثناء اللہ کی صحافتی مہارت اُن کے آڑے آنے والی تھی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا، دربار میں موسوی اِرادے کا ایک نخلِ تازہ پھوٹ رہا تھا۔ ’آفتاب‘ بہت جلد روز نامہ بن گیا اور اپنی آب وتاب سے عوامی راج کی ظلمتوں کو بے نقاب کرتا رہا۔ اِس کے اسلوب، عبارت عنوانات اور اِرادوں کی روشنی نے سلطانِ جمہور کو جگانا شروع کر دیا۔ خود خواجہ صاحب ذاتی زندگی میں افلاس اور احتیاج کی سختیاں برداشت کرتے رہے۔ لیکن اپنے جریدے کو چمک دمک سے مالا مال کرنے کے لے جتن کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے وقت کے بہترین خوش نویس عمدہ مشاہروں پر لائے۔ اُنہوں نے چھپائی کے لئے عمدہ سے عمدہ پریس دیکھے بھالے۔ اُنہوں نے ’آفتاب‘ کے صفحات قلمکاروں کے لئے وقف کر دیئے اور نئی آوازوں اور اُمیدوں کا ایک سازینہ آفتاب کے صفحات پر بجنا شروع ہو گیا۔ اُنہوں نے سرکاری کشکول کو توڑنے کے لے ایک خیال انگیز صحافی کی سب سے عمدہ تدبیر اِختیار کی۔ اُن دنوں کارپوریٹ (Corporate) دیوؤں، جنوں اور قارونوں کی آج جیسی دھکم پیل نہیں تھی۔ انہوں نے بزاز صاحب کے ہمدرد کے بعد ’آفتاب‘ کی Street Sales کے لئے ہاکر

مقرر کئے جو چوکوں، چوراہوں، بس اڈوں وغیرہ میں کوئی سنسنی خیز سُرخی کی آواز لگاتے تھے۔اور اخبار گرما گرم باقر خانیوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا اور بہت جلد وہ دِن آ گئے جب آفتاب گیارہ بجے کے بعد نہ ہاکروں اور نہ ہی نیوز ایجنٹوں کے یہاں دستیاب ہوتا تھا۔ کشمیر کے مضافات میں بھی نیوز ایجنٹوں اور نامہ نگاروں کے کبوتر اُڑنے لگے اور صبح سویرے آفتاب وادی کے ہر بڑے قصبے میں عوام کو تازہ خبروں سے سرشار کرتا رہا۔

''آفتاب'' بہت جلد قبرستانِ کشمیر میں نئی زندگی اور چہلوں کا سرچشمہ بن گیا۔ بخشی وزارت موئے مبارک کی گمشدگی کے طوفان میں غرق ہوگئی۔ لیکن عوامی اُبھار کے ارتعاشات ابھی اتنے تیز تھے کہ ایک صبح کاذب کا گمان پیدا ہوگیا۔ 'آفتاب' نئی بیداری کا نقیب اور نغمہ خوان بن گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ برسہا برس کے بعد کشمیر لوک کے دِل کی بات دھوم مچا رہی تھی۔ اُن دِنوں آفتاب کی اشاعت کئی گنا بڑھ گئی اور اِس کی حُدی خوانی سے دوسرے کشمیریوں کے دِل میں صحافت کی زنگ خوردہ شمشیر کو پھر سے تیز کرنے اور اِس کی دھار سے واقعات کی رفتار بدلوانے کی للک پیدا ہوگئی۔ ایسے لوگوں میں آئینہ کے شمیم احمد شمیم، محافظ کے رشید تاثیر، سلسبیل کے طاہر مضطر 'رہنما' کے قادری صاحب بھی شامل تھے۔ انہی دِنوں میں بھی شام کو آفتاب کے دفتر، جواب بڈشاہ ہوٹل کے عقب میں، بڈشاہ چوک اور لال چوک کے بیچ منتقل ہو گیا تھا۔ شام کو دربارداری کا ایک حصہ بن گیا کہ میں اب بڈشاہ چوک میں رہائش پذیر تھا جو اس دفتر سے دس پندرہ منٹ کی دوری پر تھا۔ یہی وقت تھا جب خواجہ صاحب نے بخشی صاحب اور اُن کے حاشیہ نشینوں کو جھڑک دیا۔ انہوں نے اب 'آفتاب' میں نئے کالم شروع کئے۔ خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے، باقی سب خیریت ہے، خبر زینہ کدل وغیرہ وغیرہ۔ میں نے آفتاب کے ایڈیٹوریل پیج کے سرعنوان کے لئے علامہ اقبال کا شعر تجویز کیا۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

جو اُس کی زینت بڑھاتا رہا۔ آفتاب اور خواجہ صاحب اِس قدر گھل مِل گئے کہ آفتاب اُن

کے نام کا حصہ بن گیا۔ ثناء اللہ آفتاب، صادق صاحب کے دور میں کشمیر میں آزاد روی یعنی Liberalization کی پالیسی شروع کی گئی۔ شیخ محمد عبداللہ اور دوسرے اسیر رہا کردیئے گئے اور 'آفتاب' اپنے نصف النہار پر پہنچ گیا۔ خود صادق صاحب کو آفتاب کی قدر تھی کہ وہ لاہور کے اخبارات 'انقلاب' 'نوائے وقت' وغیرہ کے قاری اور جرعہ نوش رہ چکے تھے۔ صادق صاحب کے زمانے میں 'آفتاب' نے حکومت پر چوٹیں لگانا شروع کیں اور صادق صاحب اِس سے محظوظ ہونے لگے۔ قاسم صاحب کے زمانے میں بھی صورتِ حال یہی رہی۔ لیکن شیخ صاحب کے ساتھ اِندرا گاندھی کے ایکارڈ پر خواجہ صاحب بہت خوش نہیں تھے اور اُن کے اس احساس کا اِظہار اُس زمانے کے 'آفتاب' میں گونجتا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں شیخ صاحب کے زمانے میں راقم کو اُس کی منشاء کے خلاف ناظمِ اِطلاعات بنایا گیا تو شیخ صاحب کو نئی سیاست گری کو مقبول عوام بنانے کے لئے ایک نفسِ ناطقہ اور ترجمان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شیخ صاحب کشمیر کے کچھ اوّلین اور اعلیٰ اخبارات کے بانی رہ چکے تھے۔ ہمدرد، خدمت، محاذ وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اُن کی اِس سلسلے میں خاص نظر تھی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں 'آفتاب' سے سلسلہ جُنبانی شروع کروں۔ میں نے بڑے تامل کے ساتھ بٹ صاحب کو مائل اور قائل کرنے کی اِمکان بھر کوششیں کیں۔ لیکن دال نہیں گل سکی۔ شیخ صاحب کا اِصرار بڑھ گیا تو میں نے نوکری بچانے کے لئے شیخ صاحب اور بٹ صاحب کی بالمشافہ ملاقات کا بندوبست کرلیا۔ آج یہ دونوں صاحبانِ ذی قدر اِس دُنیائے فانی میں نہیں ہیں اور میں بھی آغوشِ لحد سے بس کچھ قدم دور ہوں۔ لیکن دیانتداری کا تقاضا ہے کہ میں اس ملاقات کا درست حال لکھوں۔ شیخ صاحب نے اُن سے کہا کہ آپ 'آفتاب' میں ہماری حکومت اور تنظیم کے نغمہ سنجی کا سلسلہ شروع کیجئے۔ آپ کی ہر ضرورت حکومت پوری کرے گی۔ جس میں دامے درمے اور قلمے ہر رنگ میں اعانت شامل ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ آپ ہمارے ترجمان بن جائیں گے۔ حق یہ ہے کہ بٹ صاحب نے شیخ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "آفتاب" اب مجھ سے زیادہ عوام کی ملکیت اور مملکت بن گیا ہے۔ میں امکان اور اعتبار کی حد تک آپ کی حکومت اور پالیسیوں کی ترجمانی کرسکتا ہوں۔ لیکن اِسے حکومت یا کسی پارٹی کا ترجمان

بنانا نہ آپ کے حق میں اچھا ہوگا اور نہ 'آفتاب' کے لئے۔ ایک مرتبہ اس کی اعتباریت (Crediblity) پر آنچ آگئی تو یہ سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ مجھے روپے پیسے کی احتیاج تو ہے لیکن آفتاب کے ضمیر کو گروی رکھ کر ایسا حصول میرے لئے زہر کھانے کے برابر ہوگا۔۔۔۔۔انتظامی سلسلے میں اشتہار وغیرہ دینے کے سلسلے میں آفتاب حصہ بنتا ہے، وہ اس کو ملتا رہے تو وہ بہت کافی ہے۔ شیخ صاحب جیسی شخصیت کے سامنے اِس قسم کا موقف اختیار کرنا خاصی جرأت مندی کا کام تھا۔ لیکن بٹ صاحب نے اِس میں کوئی تامل نہیں کیا۔ شیخ صاحب تجربہ کار اور قیافہ شناس آدمی تھے۔ اُنہوں نے موضوع بدل کر بٹ صاحب کو چائے وغیرہ پلا کر پورے احترام کے ساتھ رُخصت کیا۔

بہر حال یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ خواجہ صاحب نے ''شیزان'' ہوٹل، جو لالہ رُخ ہوٹل کے شرق میں واقع عمارت میں تھا، کی حصہ داری بھی کی جس کے بڑے مالک خواجہ عبدالصمد چلو مرحوم تھے۔ بٹ صاحب ہر دِن آفتاب کا کام ختم کر کے وہاں محفل جماتے تھے اور احباب کو خوب کھلاتے پلاتے تھے کہ اُنہیں مہمان نوازی اور احباب پروری میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ بڑے شائستہ گفتار آدمی تھے اور باتوں باتوں میں دوسروں کی صلاحیتوں کا اندازہ لگاتے تھے۔ اِس طرح اُنہوں نے یوسف جمیل صاحب، طاہر محی الدین صاحب، بنسی نردوش، چمن لال چمن وغیرہ کے جوہرِ قابل کا سراغ پالیا اور وہ سارے 'آفتاب' میں اپنی صلاحیتوں کا جلوہ دکھانے لگے۔ خواجہ صاحب کو کتابیں لکھنے کا بھی سلیقہ تھا۔ اُن کی کئی مطبوعات شائع ہو چکی ہیں۔ ایک کتاب کی رسمِ اجرا بیگم شیخ محمد عبداللہ نے انجام دی تو ایک اور کتاب کو سید علی شاہ گیلانی نے ریلیز کیا۔ اُن کی یہ کتابیں اُس دور کے کشمیر کی اچھی خاصی صحافتی دستاویزات ہیں۔ میں آغاز میں اِشارہ کر چکا ہوں کہ خواجہ صاحب نے راقم کی زندگی بچانے میں اہم رول ادا کیا۔ بات یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں راقم پر Black Motion کا زبردست حملہ ہوا۔ اوائل جوانی کے دِن تھے۔ میں کئی دِن سمجھ ہی نہیں پایا کہ میں کس ابتلاء میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ جب میرے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے تو آخر کار اس وقت کے کشمیر کے مسیح الملک ڈاکٹر علی جان صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے ملاحظہ کیا تو سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ تم یہاں سے کتنی دور رہتے ہو؟ میں نے بڈشاہ فلیٹ کا نام لیا جو اُن کے مگھرمل باغ کلینک کے نواح میں تھا؟ اُنہوں نے کہا کہ کوئی

سواری ساتھ ہے؟ میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ ہاں ٹانگہ باہر کھڑا ہے۔ ڈاکٹر جان کی وہ نظر مجھے آج بھی چبھتی ہے جب اُنہوں نے کہا کہ جاؤ، گھر جاؤ۔ میں یہاں سے فارغ ہوکر خود وہاں پہنچ کر تمہارا علاج کروں گا۔ شاید اُن کا اندازہ یہ تھا کہ یہ اپنے فلیٹ پر آخری سانس لے سکے تو اِس کی عاقبت سُدھر جائے گی۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ نکل کر پیدل چلنے لگا۔ نمائش گاہ کے قریب جب میں نے سڑک پار کرنے کی کوشش کی۔ تو مجھے صِرف اِتنا یاد ہے کہ میں بے ہوش ہوا اور گر پڑا۔ بہر حال جب دوسرے دِن صبح کو مجھے ہوش آیا اور میں نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے ماں باپ میرے سرہانے آنسو بہا رہے ہیں اور میری رگوں میں Blood Transfusion کیا جارہا ہے۔ میرے غش کھانے کے بعد کسی طرح سے خلقِ خُدا نے مجھے اپنے فلیٹ پر پہنچا دیا تھا۔ خواجہ صاحب دفتر سے اُٹھ کر آگئے تھے۔ اُنہوں نے خون چڑھانے کا انتظام کیا تھا جو اُس زمانے میں بہت مُشکل بات تھی۔ میرے والدین کو شوپیان سے کسی ان ہونی کے اِمکان کے پیشِ نظر بلایا گیا تھا۔ میرے نصیب میں ابھی اِس خاکدان کا بہت سا دانہ پانی تھا۔ میں نے صبح آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹر جان کو اِطلاع کردی گئی۔ وہ بہ نفسِ نفیس دوڑے دوڑے آئے۔ مجھے بیدارِ چشم دیکھا تو مجھ سے بات کی۔ میں نے جواب دیا تو اُن کی نادر و نایاب مسکراہٹ کی دھوپ پھیل گئی۔ انہوں نے میرا ماتھا تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ مبارک ہو۔ تمہیں سچے معنوں میں نئی زندگی ملی ہے۔ اب تم آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں مہینہ بھر بستر پر پڑا رہا اور جب ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اِسے پاؤں پر کھڑا کر کے چلنے کی مشق کراؤ تو اُس وقت خواجہ ثناء اللہ بٹ نے اپنے کاندھوں پر میرے بازو پیوست کرلئے۔ خواجہ صاحب! اللہ تعالیٰ جو دِلوں کے راز بہتر جانتا ہے۔ گواہ ہے کہ میرے ذہن میں آپ کی وہ مسکراہٹ آج بھی نقش ہے اور آپ کی گھنی گھنی کالی مونچھوں کا سایہ جن کے متعلق خود آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ بالکل سفید ہیں مگر خضاب کی کرشمہ زائی سے یوں خواجہ خضر کی داڑھی کی طرح جواں نظر آتی ہیں ع

مدت رہیں گی یاد یہ باتیں تمہاریاں

...... ●●● ......

☆...... پروفیسر بشیر احمد نحوی

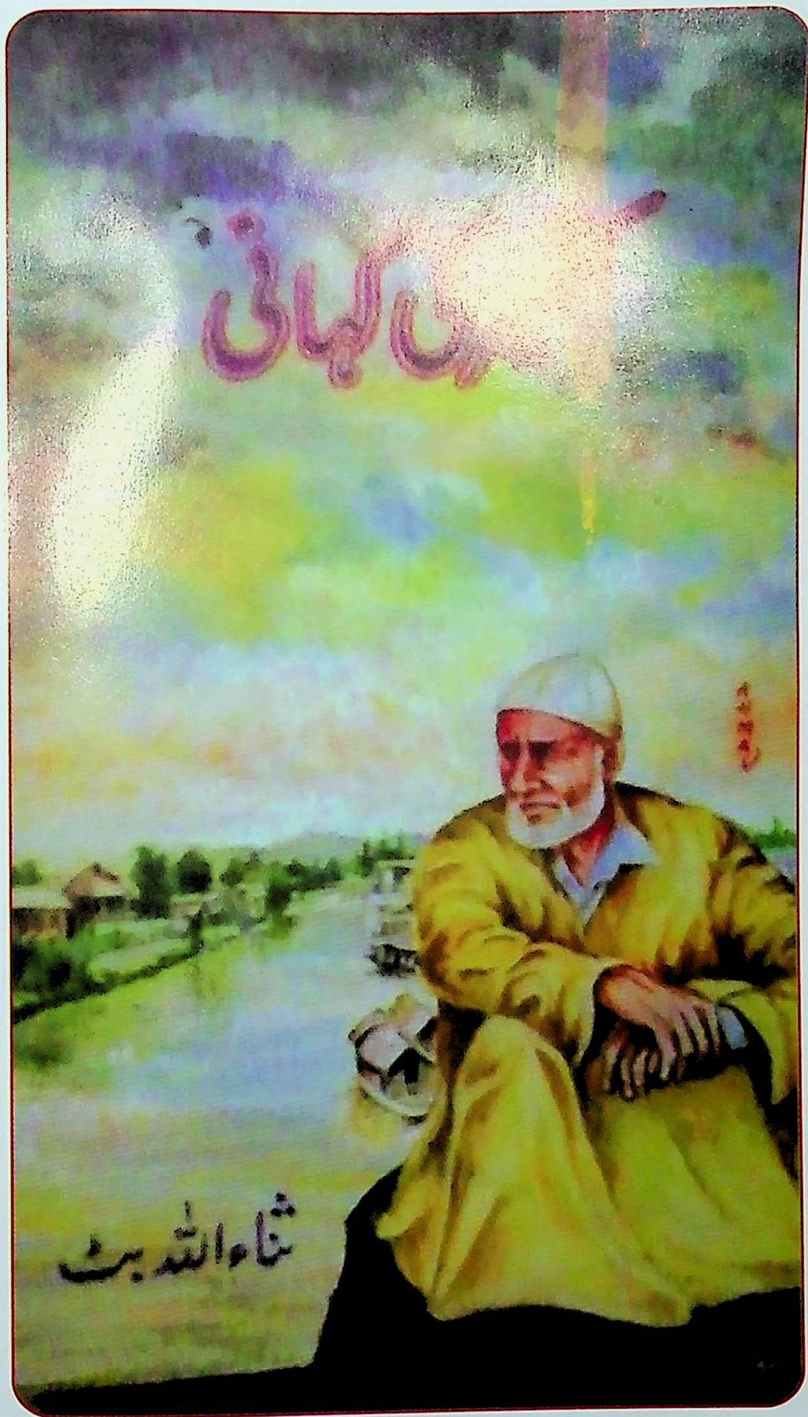
میرا اوّلین محسن

کشمیر کی اُردو صحافتی تاریخ میں چند نام اس قدر معتبر اور بااثر گزرے ہیں کہ جب بھی صحافت کا طالبِ علم تلاش وتحقیق کی راہوں پر گامزن ہوگا تو ان سربرآوردہ ناموں کے نقوش اور نشانات اسے قدم قدم پر رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے۔ آج جس ''یادگارِ صحافت'' سے وابستہ یادوں کا تذکرہ ہوگا وہ پچاس سال کے طویل عرصے تک ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے''، رنگین، مقفیٰ اور مسجع کالم تحریر کرنے والی شخصیت، مدیرِ ''آفتاب'' خواجہ ثناء اللہ بٹ مرحوم ہیں جو میرے لئے اوّلین محسن اور مُشفق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

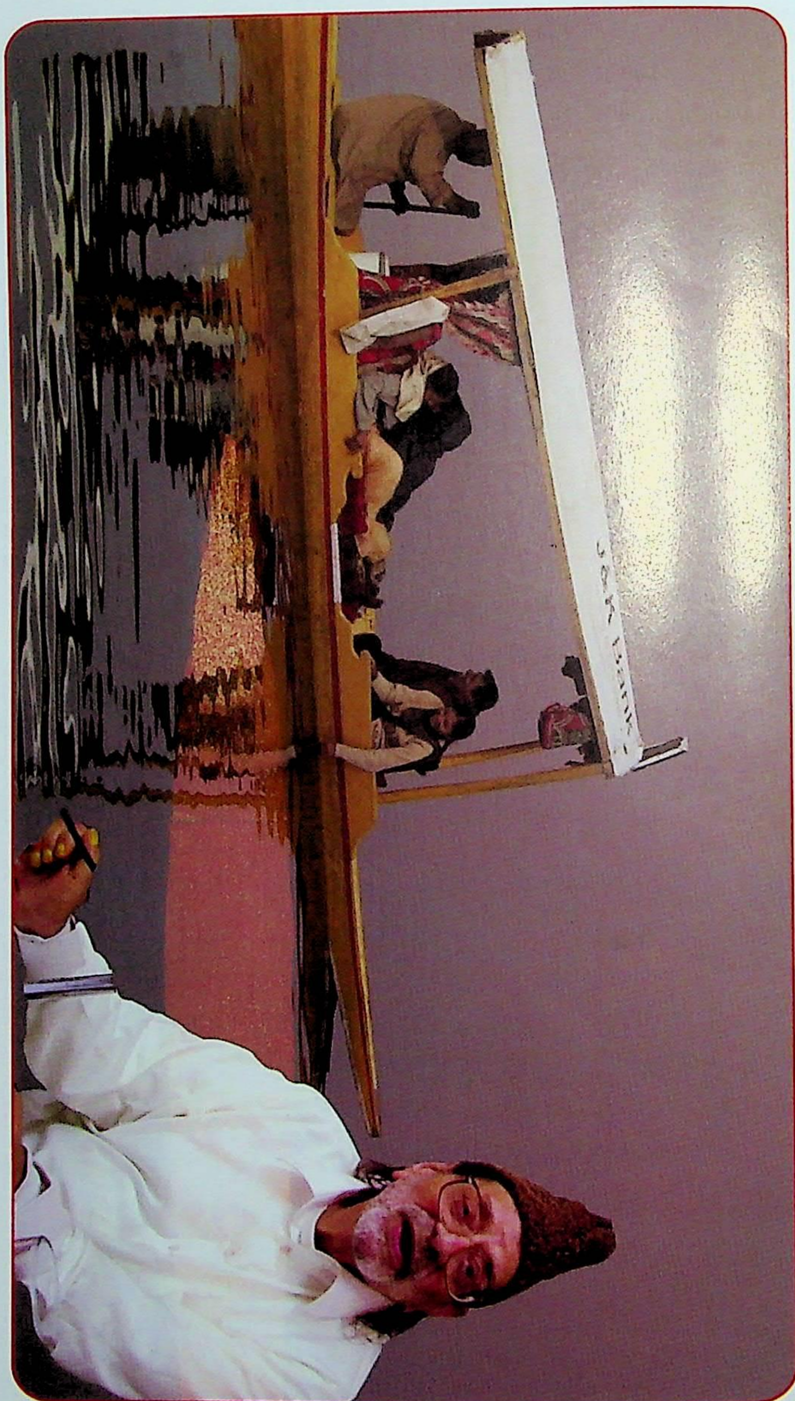
وادیٔ کشمیر کی آبادی کا ایک طبقہ تقسیمِ ہند سے پہلے ملک کے مختلف شہروں میں تجارت یا مزدوری کے سلسلے میں جایا کرتا تھا۔ مزدوروں اور تاجروں میں کچھ باصلاحیت افراد ہوا کرتے تھے جو اپنا پیشہ تبدیل کر کے اپنے مزاج کے مطابق کوئی اور ذریعۂ معاش تلاش کرتے تھے۔ ایسے ہی طبقے سے وابستہ ایک فرد خواجہ ثناء اللہ بٹ بہ غرض تجارت واردِ پنجاب ہوئے۔ تجارت سے اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے صحافت کی طرف راغب ہوئے اور طبیعت میں فطری بغاوت کے عنصر نے کہیں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وطن واپس لوٹتے ہی سرینگر سے روزنامہ ''آفتاب'' کی اشاعت کا صبر آزما قدم اٹھایا لیکن شب وروز کی محنت، وادی کے کونے کونے میں اخبار کی فروخت کیلئے ایجنسیوں کا قیام، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں سے رابطہ، بہترین خطاطوں کا تقرر اور اخبار کے لئے اپنا پرنٹنگ پریس قائم کرنے کی تگ ودو بارآور ثابت ہوگئی۔ ''آفتاب'' کے طلوع کا ہر دفتر، ہر گھر، ہر شہر، ہر بازار اور ہر قسم کے مذہبی وسیاسی مکاتبِ فکر کے لوگوں کو انتظار رہتا تھا۔



خواجہ ثناءاللہ بٹ نامور خطاط شبیر احمد رضوی کے ساتھ۔

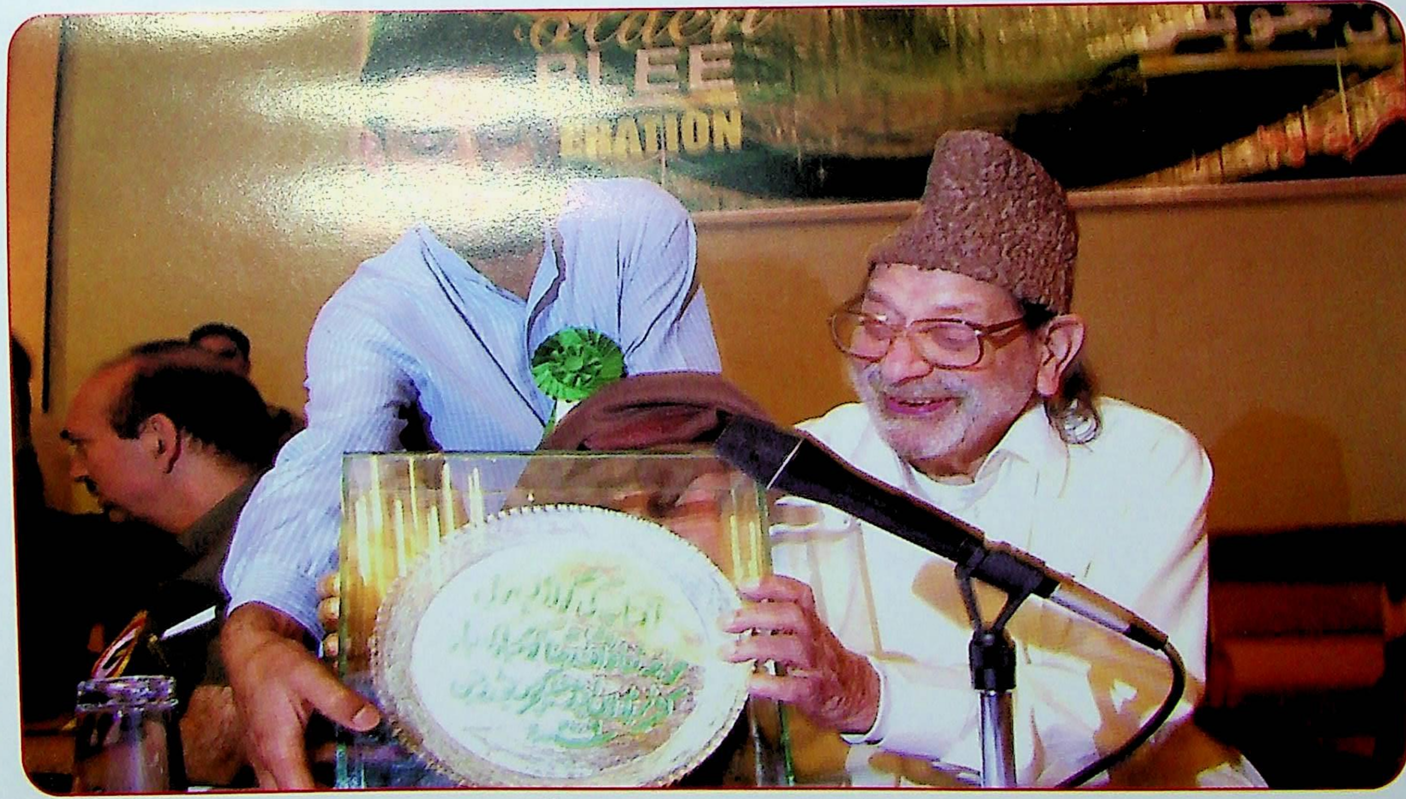


خواجہ ثناء اللہ بٹ کی تصنیف "کشمیر کی کہانی" کا سرورق۔

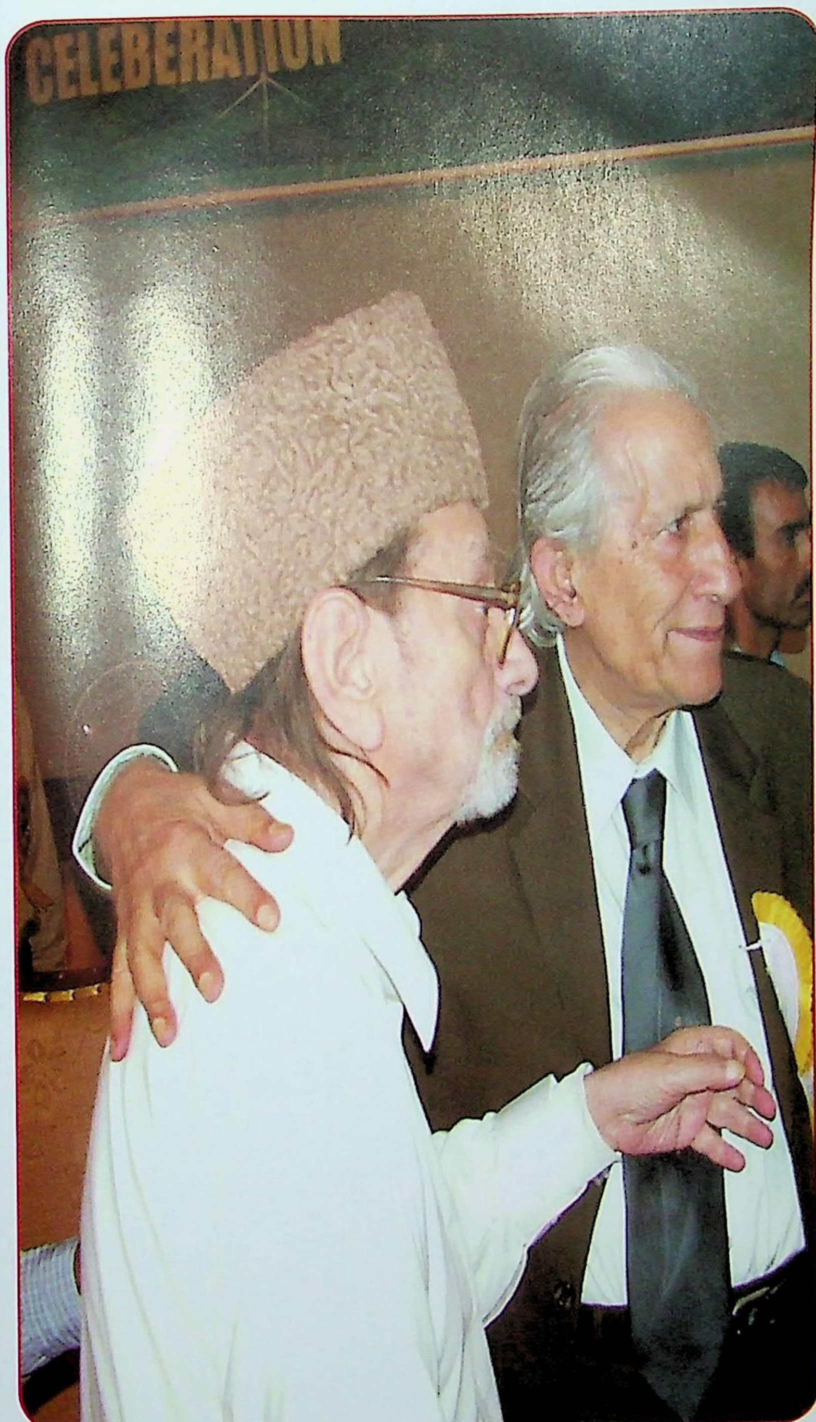

J&K Bank



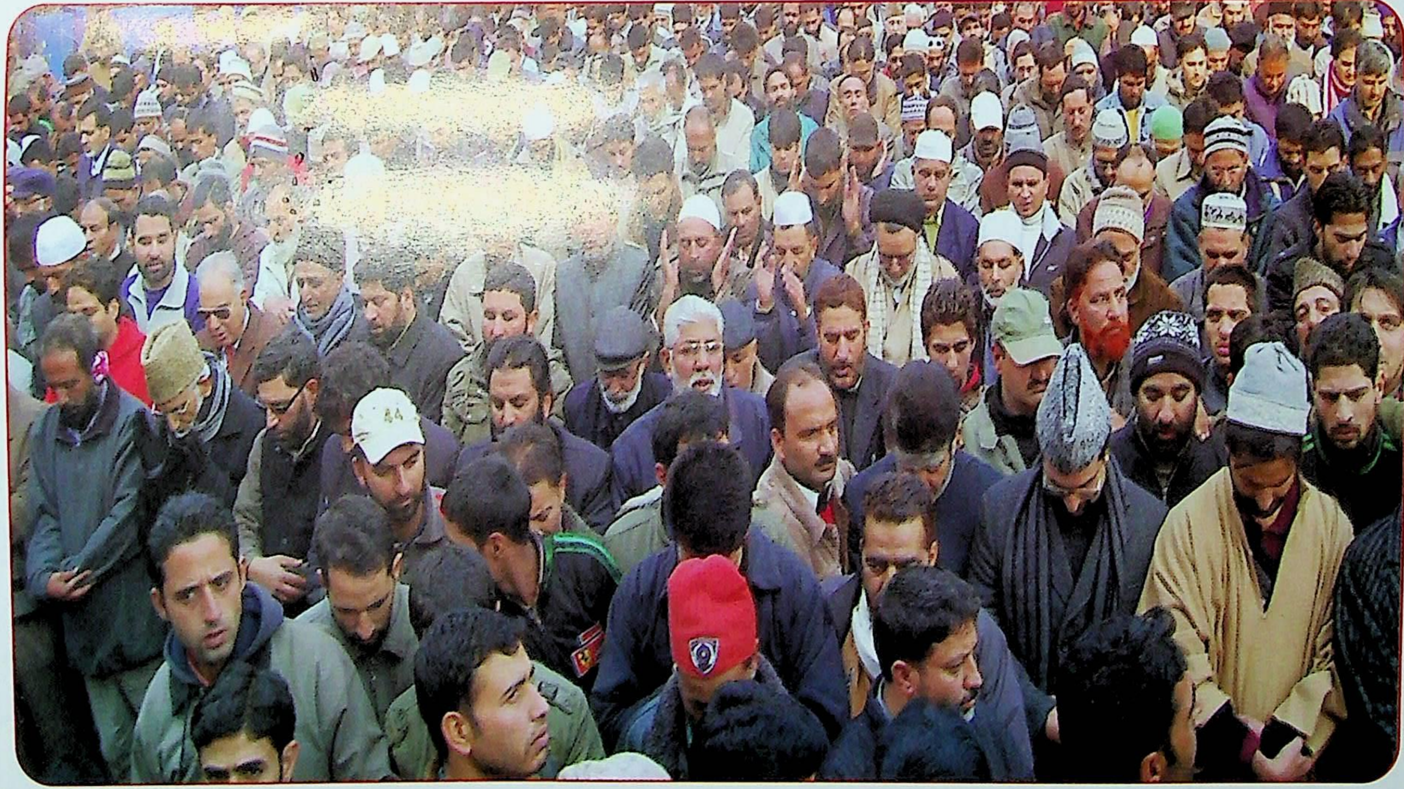
خواجہ صاحب کی اپنے رفقاء کے ساتھ ایک یادگار تصویر۔



''آفتاب'' کی جشنِ زریں تقریب سے لی گئی تصویر۔



خواجہ ثناء اللہ بٹ اور صوفی غلام محمد۔



جلوسِ جنازہ۔



خواجہ ثناءاللہ بٹ کی ابدی قیام گاہ پر فاتحہ خوانی۔

خواجہ صاحب کسی کالج یا یونیورسٹی کے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن لاہور، مظفر آباد اور کراچی کے اُردو اخبار نویسوں، دانشوروں، اور شاعروں کا اثر انہوں نے کہیں کلّی طور اور کہیں جزوی طور پر قبول کر لیا تھا۔ آفتاب کی شہ سرخیوں اور بغلی سرخیوں میں مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار'' آغا شورش کاشمیری کے ''چٹان'' دیوان سنگھ مفتوںؔ کے ''ریاست'' ''امروز'' اور ''نوائے وقت'' کے اثرات اور مذکورہ اخبارات کے انتہائی تر دماغ صحافیوں کے لب و لہجے کا طمطراق موجود تھا۔ اخبارِ آفتاب اپنی شروعات سے ہی معاشرے کے مختلف النوع مسائل پر خبریں، اداریئے، مراسلے اور مضامین شائع کرتا رہا۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء کے بعد یہ اخبار وادی کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامے کی شکل میں خوبصورت کتابت و طباعت کے ساتھ ہر صبح منظرِ عام پر آتا رہا۔

۱۹۷۷ء کے اواخر میں راقم کا داخلہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں ہوا۔ اسی زمانے میں یونیورسٹی کی ایک تقریب میں پہلی بار روبرو میری ملاقات خواجہ صاحب سے ہوئی۔ دورانِ گفتگو انہوں نے بڑے محبت آمیز لہجے میں دفترِ آفتاب آنے کو کہا۔ چند دن بعد میں ان کے دفتر میں حاضر ہوا۔ انہوں نے مجھے اقبالیات، اسلامیات، ادبیات اور تاریخ کی انقلابی شخصیات پر صحافتی نوعیت کے ہلکے پھلکے مضامین لکھنے کی ترغیب و تحریک دی۔ میں نے اپنا پہلا اخباری مضمون ''جوشؔ ملیح آبادی کی انقلاب انگیزی'' کے زیرِ عنوان تحریر کیا۔ اس طرح ادبی، دینی، سماجی اور سیاسی نوعیت کے مضامین، شخصیتوں کے مرقعے اور انٹرویو تسلسل اور تواتر کے ساتھ چھپنے لگے۔ میری یہ عادت تھی کہ جو بھی کوئی مضمون یا مراسلہ خواجہ صاحب کے سپرد کرتا دوسرے دن شام چھے بجے اس کا پروف پڑھ کر لال چوک، ڈل گیٹ یا بٹوارہ سے بس میں سوار ہو کر بجبہاڑہ کیلئے روانہ ہو جاتا۔ محمد صدیق صاحب یا مرحوم شبیر رضوی صاحب دو معروف خوش نویس تھے جو میرے مضامین تحریر کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں خواجہ صاحب سے قریب تر ہوتا گیا۔ ایک دن انہوں نے ازراہ شفقت مجھ سے کہا کہ ''آپ آفتاب میں مستقلاً کام کیجئے۔ دوردرشن میں جو کچھ مراعات آپ کو مل رہی ہیں اس پر پانچ سو روپے کا اضافہ ہوگا''۔ میں نے ہفتے کی مہلت مانگی تاکہ میں اپنے خیر خواہوں سے مشورہ کروں۔ میں نے ہائی کورٹ کے اپنے دو کرم فرما

وکیلوں سے جن میں ایک ریاستی ہائی کورٹ کا ۔ جج بھی ہو گیا تھا، سے مشورہ کیا کہ کیا میں ملازمت کو خیرباد کہہ کے اخبار ''آفتاب'' کی مجلسِ ادارت میں شامل ہو جاؤں۔ دونوں دوستوں نے کہا نہیں۔ دونوں خواجہ صاحب کے مزاج کی تیزی اور کڑوے پن سے باخبر تھے۔ بہر حال میں سال ہا سال تک لکھتا رہا چنانچہ ریاست کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں پر میری تجزیاتی رپوتاژ ''پطرس کاشمیری'' کے قلم سے چھپتی تھی۔

۱۹۸۲ء کے اوائل کی بات ہے کہ راقم نے یونیورسٹی میں ایم۔فل کے لئے داخلہ لیا۔ دریں اثنا میر واعظ مرحوم مولانا محمد فاروق نے یونیورسٹی میں پندرہویں صدی ہجری تقریبات کے ایک جلسے میں میری گفتگو سنی۔ انہوں نے مجھے اپنے صاحبزادے موجودہ میر واعظ عمر فاروق صاحب کو، جو پانچویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا، کا اتالیق بننے کے لئے کہا۔ میں نے میر واعظ صاحب کی تجویز مان لی۔ میں روزانہ شام کو ایک گھنٹے تک عمر صاحب کو پڑھاتا تھا اور پھر سیاسی، علمی اور دینی موضوعات پر مرحوم میر واعظ سے بھی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ میر واعظ صاحب اہلِ علم و دانش کی چاہے وہ کسی بھی مکتبۂ فکر سے منسلک ہوں بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک دن میر واعظ صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''ثناء اللہ آفتاب نے ہمیں پریشان کر دیا ہے۔ روز ہمارے خلاف خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' والے کالم میں لکھتا رہتا ہے۔ کیوں نہ غلط فہمی کو رفع کیا جائے اور ''ایک ملاقات کا بندوبست ہو''۔ میں نے خواجہ صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔ چنانچہ ایک اتوار کی سہ پہر کو صورہ میں میڈیکل انسٹی چیوٹ کے عقب میں واقع خواجہ صاحب کی رہائش گاہ پر ملاقات ہوئی۔ میر واعظ مرحوم کو اب اطمینان ہو گیا تھا کہ آئندہ آفتاب میں تنقید و تنقیص کا دفتر بند ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خواجہ صاحب نے پھر اپنے مخصوص کالم میں لکھا '' آنا میر واعظ کا غریب خانے پر''۔ وہ اپنی تحریری تگ و دو میں وہ نرم نہیں پڑے۔ ویسے بھی ان کے دفتر کو کئی بار مختلف انجمنوں، سیاسی جماعتوں اور تجارتی تنظیموں کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کا دل و دماغ پتھراؤ، توڑ پھوڑ، دھمکی اور دباؤ سے کبھی خائف نہیں ہوتا تھا۔ میر واعظ خاندان کے بزرگوں مرحوم رسول شاہ اور میر واعظ یوسف شاہ کے بارے میں خواجہ صاحب نہایت درجہ عقیدت و احترام

کے جذبات کا اظہار کرتے تھے۔

خواجہ ثناء اللہ صاحب کشمیر کی سیاسی صورت حال کے بارے میں عوام کی اکثریت کے جذبات، احساسات وخواہشات کے مطابق سوچتے اور بسا اوقات اس کا تحریر وتقریر میں اظہار بھی کرتے تھے۔قومی سیاست کے مقامی رہنماؤں کے خلاف وہ اکثر فقرے کستے رہتے تھے۔ کشمیر کے تئیں ان کے منافقانہ طرزِ عمل سے خواجہ صاحب بہت ہی دلبرداشتہ تھے۔لیکن کہیں کہیں تضاد کا عنصر بھی خواجہ صاحب کے ہاں نظر آتا تھا۔ ۸ ستمبر ۱۹۸۲ء کو شیخ محمد عبداللہ جب انتقال کر گئے تو ۹ ستمبر ۱۹۸۲ء کے ''آفتاب'' کا سرورق سیاہ رنگ میں مرحوم شیخ صاحب کی تصویر کے ساتھ چھپا تھا اور نیچے علامہ اقبال کا ایک شعر درج تھا جو اقبال نے یورپ سے واپسی کے موقع پر جنوبی اٹلی کے ساحل سے گزرتے ہوئے جزیرۂ سسلی میں مسلمانوں کے اس اہم مرکز کے زوال وادبار کے حوالے سے کہا تھا ؎

جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہیں
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہیں

اخباری انٹرویو یا اہم مواقع پر سیاست دانوں کے بیانات قلمبند کرنے کیلئے وہ گاہے گاہے ۱۹۸۵ء تک سیاسی رہنماؤں کے گھر یا دفتر جایا کرتے تھے۔لیکن کشمیر میں نامساعد حالات شروع ہونے کے ساتھ ہی انہوں نے مکمل گوشہ گیری اختیار کی اور صورہ کی رہائش گاہ بھی سنسان ہو کر رہ گئی۔خواجہ صاحب کی عظمت وجلالت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب ان کی وفات کے بعد اخبارات میں یہ خبر مشتہر ہوگئی کہ انہوں نے اپنا مکان اور اس سے ملحقہ اراضی اپنے دو وفادار ملازموں کے نام ہبہ کردی تھی۔

راقم نے دوردرشن میں دورانِ ملازمت کئی شخصیات کے انٹرویو ''نقوش'' پروگرام کے نام سے دستاویزی فلموں کی صورت میں ترتیب دیئے تھے۔اس زمانے میں صرف پی۔ ٹی۔ وی، سرینگر دوردرشن اور ساڑھے آٹھ بجے سے نیشنل پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا کرتے تھے۔کسی ٹی۔وی چینل کا نام ونشان نہیں تھا۔چنانچہ دوردرشن پر آنا شہرت کا ایک اہم ذریعہ تھا۔''نقوش''

پروگرام میں شمولیت سے چند شخصیتوں نے قطعاً انکار کیا اور ادھر ڈائریکٹر دور درشن مرحوم مظہر امام بضد تھے کہ تین شخصیتوں کو پروگرام میں آنے کے لئے کسی طرح سے آمادہ کیجئے۔ یہ تین شخصیتیں تھیں معروف معالج ڈاکٹر علی جان، مشہور ادیب و نقاد پروفیسر محی الدین حاجنی اور خواجہ ثناء اللہ بٹ۔ موخر الذکر دو شخصیتوں کے انٹرویو لینے میں مجھے کامیابی ملی، لیکن ڈاکٹر علی جان ہرگز تیار نہیں ہوئے۔ خواجہ ثناء اللہ صاحب سے ان کے دفتر میں دستاویزی پروگرام ریکارڈ کیا گیا۔ پوری گفتگو ترش خوئی، سیاست دانوں کے خلاف غیظ و غضب، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں بددیانتی، مذہب کے نام پر استحصال۔ غرض پروگرام دوردرشن کے ضوابط کے مطابق قابل نشر و اشاعت نہیں تھا۔ مشکل سے پروگرام کو ایڈیٹ کر کے پندرہ منٹ کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد پروگرام کے ایک بیان کی طرف خواجہ صاحب کے دفتر کے ایک سابق ملازم نے ڈل گیٹ میں میری توجہ مبذول کرائی جب ان سے میں نے پوچھا کہ ''کس سیاسی شخصیت نے موجودہ عہد میں آپ کو متاثر کیا'' تو ان کا جواب تھا۔ ''مہاتما گاندھی'' پھر مقامی رہنماؤں اور گاندھی جی کا انہوں نے موازنہ کیا۔ اور اقبال کا یہ شعر پڑھا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

۱۹۷۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء کے اوائل تک ان کے دفتر متصل پلیڈیم گلی میں تین بجے سے سات بجے تک ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کا آنا جانا ہوتا تھا۔ اشتہارات، بیانات، تصاویر، مراسلے، خبریں اور افواہیں لے کے لوگ آتے تھے اور خواجہ صاحب سے ملتے، علیک سلیک کے بعد واپس چلے جاتے تھے لیکن کچھ اصحاب ان کی صحبت و معیت اور ان کے گہرے مشاہدے تجربے اور پختہ دماغی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان میں محمد شفیع اوڑی، مرحوم عبدالغنی لون، مرحوم حکیم منظور، مرحوم پروفیسر ستار احمد شاہد، مرحوم محمد امین بچھ، مرزا غلام حسن بیگ عارف، پیر نظام الدین، ظریف احمد ظریف، چمن لال چمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے روبرو اخبار کے معاون مدیر طاہر محی الدین ایڈیٹر ہفتہ روزہ ''چٹان'' اور یوسف جمیل ہوا کرتے تھے۔ بعد میں

خواجہ صاحب کی سخت گیر طبیعت کو رام کرنے والے شریف النفس قلمکار ظہور ہاشمی ''آفتاب'' میں خبروں کے کالم کی مکمل طور پر نوک پلک سنوارتے رہے اور اس وقت بھی آفتاب کی حدت اور تمازت ان کی خلوتوں سے قائم ہے۔

خواجہ صاحب حقیقی معنوں میں اقبالؒ کے شیدائی تھے۔ ان کے اخبار میں اداراتی صفحہ کی پیشانی پر ہمیشہ کشمیر کی تعریف میں لکھا گیا وہ شعر آنکھوں کو تمازت اور طراوت فراہم کرتا ہے۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

گفتگو کے دوران وہ اکثر اونچے لہجے میں کہا کرتے تھے کہ ''میرے مرشد اقبالؔ نے خوب فرمایا ہے''۔ خواجہ صاحب اکثر کہا کرتے تھے۔ ''اقبالؔ کی زندگی کا ہر ورق قوم کی زندگی کے لیے نیا پیغام لاتا تھا''۔ کشمیر کے تناظر میں لکھے گئے اُردو اور فارسی اشعار دہراتے وقت وہ جذباتی ہو جاتے تھے اور اس طرح کشمیر اور اہلِ کشمیر کی مظلومیت کا کوئی گوشہ، ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ درج ذیل شعر گھن گرج کے ساتھ دہراتے وقت وہ ٹیبل پر ایسے ضرب لگاتے تھے کہ ہاتھ اور میز دونوں کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
بہ ریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبے تنش جامۂ تار تارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

..........●●●..........

☆...... غلام نبی خیالؔ

خواجہ ثناءاللہ کی صحافتی شخصیّت

یہ ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ میں ریڈیو کشمیر سری نگر میں نیوز ریڈر اور اناؤنسر کے عہدے پر فائز تھا۔ حبیب اللہ علاقہ بند اس شعبے کے سربراہ اور جگن ناتھ ولی نائب سربراہ تھے۔ یہ وہی ولی صاحب تھے جنہوں نے پہلی بار کشمیری زبان میں حبہ خاتون پر ایک ڈراما لکھا تھا۔

شعبے کے لئے نامہ نگاری کا کام کرنے والا برج کشن تپھی ایک دن بعد دوپہر کمرے میں آیا اور ولی صاحب سے کہنے لگا کہ وہ آج کے بلٹن کی شاہ سرخی کے لئے جگہ خالی رکھیں کیونکہ ایک اہم خبر آنے والی ہے۔ شام کو تپھی ایک لمبا چوڑا بیان لے کر آیا جو سرحد پار سے واپس لوٹنے والے ثناءاللہ بٹ نامی کسی کشمیری اخبار نویس نے دیا تھا اور جس میں اس نے پاکستانی کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم کو پانی پی پی کر کوسنے کے علاوہ وہاں کی سرکار کی بھی خوب خبر لی تھی۔۔ ثناءاللہ کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ اسے سردار قیوم نے مظفر آباد سے نکال کر سرحد کے اِس پار دھکیل دیا تھا جس کے حوالے سے طرح طرح کی باتیں کی گئیں۔

اس کے کچھ عرصے بعد ثناءاللہ نے ایک بار مجھے بتایا کہ دراصل اس نے مظفر آباد میں اپنے اخبار میں قیوم سرکار کی رشوت ستانی اور ناقص کارکردگی کے خلاف کئی اداریئے تحریر کئے تھے جس کی پاداش میں اسے وہاں سے نکالا گیا۔

سری نگر وارد ہونے کے بعد بٹ نے آفتاب نامی ایک اردو ہفت روزہ جاری کیا جس کا دفتر پہلے بڈشاہ مارکیٹ میں قائم کیا گیا۔ یہ پہلا مصور جریدہ تھا۔ بٹ صاحب نے جب اپنے ہفتہ وار اخبار کو ایک روزنامے میں تبدیل کیا تو اس کی اشاعت پانچ سو سے دوگنی

ہوکر ایک ہزار کی گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک واحد روزنامہ منظر عام پر آ گیا جسے قارئین ہر روز پڑھتے تھے۔ ثناءاللہ نے اس اخبار میں مقامی طور پر یہاں کے نوجوان اور ابھرتے ہوئے نوواردگانِ صحافت کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اپنے ادارے میں جگہ دی جن میں بنسی لال کاک، عمر مجید، ظریف احمد ظریف، طاہر محی الدین، یوسف جمیل وغیرہ شامل تھے۔اس اخبار کی ادارتی پالیسی اگر چہ سرکار نواز ہی تھی لیکن اسے دیکھتے دیکھتے سارے کشمیر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔

اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ بدری ناتھ مٹو کشمیری پنڈتوں کے ترجمان روزنامہ ''مارتنڈ'' کا مدیر تھا لیکن یہ اخبار صوری اور معنوی لحاظ سے ایک غیر معیاری جریدہ تھا اور اس کے پڑھنے والے پنڈت فرقے میں بھی روز بہ روز کم ہوتے جارہے تھے۔اس مسئلے پر کسی حدتک قابو پانے کے لئے ایک دن مٹو ثناءاللہ بٹ کے پاس گیا اور اس کے سامنے مارتنڈ کی ناگفتہ بہ حالت بیان کی اور مدیرِ آفتاب سے یہ صلاح بھی مانگی کہ مارتنڈ کو مقبولِ عام اخبار بنانے کے لئے کیا کیا جائے؟ ثناءاللہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں منہ پر ایک طنزیہ مسکراہٹ لاتے ہوئے مشورہ دیا کہ ''مارتنڈ'' آفتاب کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شروع کرے اور آفتاب میں بھی اس کے جواب میں ایسے ہی طنزیہ مضامین شائع کئے جائیں گے۔ چنانچہ کشمیریوں کو ایسی رقابتی خبروں سے روایتی دلچسپی ہے لہٰذا لوگ ان دونوں اخباروں کو باقاعدگی کے ساتھ پڑھتے رہیں گے۔ایسا ہی ہوا اور مارتنڈ کی ڈوبتی کشتی کسی حدتک کنارے کے قریب پہنچ سکی۔

اس کے کچھ عرصے بعد مدیر آفتاب کے تعلقات شمیم احمد شمیم کے ساتھ استوار ہوگئے جس نے صادق صاحب کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں آئینہ نام کا ایک ہفتہ وار اخبار شروع کیا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں صادق صاحب کے انتقال کے بعد شمیم نے ۱۹۷۵ء میں شیخ محمد عبداللہ کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد شیخ صاحب کی قربت حاصل کرلی اور شیخ صاحب نے بھی تشہیر کے لئے شمیم کو '' آئینہ'' ایک روزنامے میں تبدیل کرنے کی صلاح دی۔ آئینہ روزنامہ اخبار تو بن گیا مگر اس کی افادیت اور مدیر کی قلمی صلاحیت سیاسی خبروں پر قربان ہوگئی۔

۱۹۸۶ء میں پاکستان کے دورے کے دوران مجھے مظفر آباد جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں

ایک دن وہاں کے ایوانِ صحافت یعنی پریس کلب کی طرف سے میرے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ حاضرین میں ثناءاللہ بٹ کا بھائی محمد صدیق بٹ بھی موجود تھا جو مظفر آباد سے ایک غیر معروف اخبار آزاد کے نام سے چلا رہا تھا۔

زندگی کے آخری ایام میں بٹ صاحب اپنے اخبار کے ساتھ شب و روز جڑے ہوئے تھے اور وہ شاذ و نادر ہی کسی سماجی، صحافتی یا ادبی تقریب میں شامل ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک بار اپنے ایک سابقہ بہی خواہ کے سامنے یہ شکایت بھی کی تھی کہ زمانے نے اُن کی وہ قدر نہیں کی جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق تصور کرتے تھے۔ غالباً وہ یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ان کے مدح خواں رفتہ رفتہ ان سے دور ہوتے گئے اور انہیں اس کو دنیا میں تنِ تنہا چھوڑ کر اپنی دھن میں مگن رہے۔

ثناءاللہ بٹ صاحب کی صحافتی خدمات کو نظر انداز کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ اللہ تعالی انہیں آخرت کی تمام تر راحتیں عطا کرے۔



☆...... یوسف جمیل

اُلفت اور خفگی کی قندی کہانی

جب سے ہوش سنبھالا، ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو جو غالباً سرینگر کے نواکدل علاقے کا مکین تھا، ہر صبح گھر کی دہلیز پر آفتاب کے تازہ شمارے کی کاپی رکھ کر جاتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اُردو ہمارے اسکول کے نصاب میں ایک لازمی مضمون تھا۔ لہٰذا اخبار پڑھنے میں زیادہ دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ البتہ کوئی خبر یا مضمون سمجھنے میں مشکل آتی تو اُسے وہیں چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن اخبار کی اہمیت اور افادیت کا احساس مجھے اُس دِن ہوا جب آفتاب میں ایک اہم اور غمناک خبر کو پڑھنے یا سُننے کے لئے ہمارے کم سے کم نصف درجن پڑوسی ہمارے گھر چلے آئے۔ دراصل پورے علاقہ میں چند ایک گھروں اور ایک آدھ دکانوں پر ہی اخبار باقاعدگی کے ساتھ زرِ چندہ کے عوض پہنچتا تھا۔ باقی لوگ اسے مفت میں پڑھنے کے عادی تھے اور یوں کسی بھی ایک اخبار کے کسی ایک دِن کے شمارے کی ایک کاپی آٹھ سے پندرہ لوگ پڑھتے تھے۔ اسی لئے اُس زمانے میں ہر اخبار میں ''اخبار خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالئے'' کی گزارش نمایاں طور شائع کی جاتی تھی۔

۷ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو ریڈیو پاکستان سے اچانک یہ خبر نشر ہوئی کہ کشمیر کے میر واعظ مولوی محمد یوسف شاہ راولپنڈی میں انتقال کر گئے ہیں۔ ہمارا غریب خانہ سرینگر کے پرانے شہر میں واقع میر واعظ منزل کے بالمقابل تھا، راتوں رات ہزاروں کی تعداد میں مرد وزن وادیٔ کشمیر کے قریب وجوار سے ہمارے علاقے میں اُمڈ آئے۔ ہر آنکھ نم تھی، بالخصوص میر واعظ منزل کے سامنے ماتم کرنے والوں کو زار وقطار روتے ہوئے اور ان میں شامل خواتین کو سینہ کوبی کرتے

ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔

اگلی صبح جب آفتاب کا تازہ شمارہ ہمارے گھر پہنچا تو والد صاحب اس میں شائع میر واعظ کے انتقال کے بارے میں خبر کو بلند آواز میں پڑھنے لگے اور ہمارے مہمان خانہ میں موجود ہمارے پڑوسی، چند رشتہ دار اور میرے والد کے قریبی دوست انہیں بڑی خاموشی سے سن رہے تھے۔ یہ انٹرنیٹ کا زمانہ تھا نہ وٹس اَپ ابھی معرضِ وجود میں آیا تھا۔ فیس بک اور ٹویٹر کی اصطلاحات تک لوگوں کے وہم وگمان میں سرایت نہ کرسکی تھیں۔ وہ موبائل فون کے کرشموں سے بھی نابلد تھے۔

کسی نے کہا آفتاب کے مُدیر و مالک خواجہ ثناء اللہ بٹ چونکہ میر واعظ مرحوم کے قریبی ساتھ رہ چکے ہیں اس لئے اس اخبار میں نہ صرف اُن کے انتقال کی خبر کو نمایاں اور ''شایانِ شان'' طور پر چھاپا گیا ہے بلکہ اخبار کے اس شمارے میں ان کی ذاتی زندگی، سیاسی اور مذہبی کاوشوں کے بارے میں جو باتیں چھپی ہیں شاید ہی کسی اور اخبار میں پڑھنے کو ملیں۔ یہ پہلی مرتبہ تھا جب میرے کانوں میں خواجہ صاحب کا نام پڑا۔

غالباً میں آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ آفتاب کے ساتھ ساتھ سرینگر سے شائع ہونے والا ایک اور اُردو روزنامہ عوامی مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ میں اپنی پاکٹ منی یا جیب خرچہ میں سے کچھ رقم بچا کر اس سے اس اخبار کے علاوہ ماہانہ شمع اور ہفت روزہ کہکشاں خریدنے لگا تھا۔ لیکن بوجوہ شمع اور کہکشاں کو اپنے والدین اور برادرِ اکبر کی نظروں سے چھپانے کی سعی کے طور پر انہیں نصابی کتب کی ڈیسک کے نیچے رکھتا تھا۔ والد صاحب نے جو پیشے سے اُستاد تھے جب ایک دِن آفتاب کے ساتھ دوسرے اخبار کو میری میز پر پایا تو کہنے لگے۔ ''دیکھو اگر تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہاری (اردو) زبان خراب ہو تو آفتاب کے بغیر فی الوقت کوئی اور اخبار نہ پڑھو اور یہ بات مجھ سے چھپی نہیں ہے کہ تم کچھ فلمی جریدے بھی خرید کر لاتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ان فضولیات میں وقت اور پیسہ ضائع کرنے کی بجائے تم اپنی مرّوجہ تعلیم پر توجہ دو۔'' میں نے شمع اور کہکشاں

خریدنا تو نہیں چھوڑا لیکن آفتاب کے ساتھ لگاؤ جنوں میں بدلنے لگا اور اس میں شائع ہر مضمون اور ہر خبر کو بڑے انہماک سے پڑھنا ایک ایسا معمول بن گیا جو حال حال ہی چھوٹا اور اس کی وجہ اس اخبار کا گرتا ہوا معیار ہے۔

میر واعظ مرحوم کے جانشین مولوی محمد فاروق برانگیختہ نہیں بلکہ مضطرب نظر آرہے تھے۔ سرینگر کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ پر اپنے خطاب کے دوران انہوں نے لوگوں سے کہا کہ اخبارات میں جو کچھ چھپ رہا ہے وہ اس سے ہرگز متاثر یا مرغوب نہ ہوں۔ قابلِ ادراک تھا کہ ان کا اشارہ روزنامہ آفتاب میں شائع شدہ میرے ایک مضمون کی طرف تھا۔ حالانکہ ابھی اس کی پہلی قسط ہی منظرِ عام پر آگئی تھی۔ مضمون میں اس طریقِ کار کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا جس کے تحت اس ممتاز اور تاریخی عبادت گاہ جو ہمارے مخصوص قومی مزاج اور شناخت کی کبیر علامات میں شمار ہوتی ہے، کے امور چلائے جارہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ مضمون میں ابھاری گئی باتوں اور مسائل کو نظر انداز کریں تاہم انہوں نے سنجیدہ فکر اور بامروت ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ یہ کہہ کر "مضمون نگار کوئی ناشناسا نہیں بلکہ اپنا ہی ایک عزیز ہے۔"

میر واعظ میرے ہمجوار تھے، نیز میرے دادا مسلم کانفرنس کے ایک فعال رکن رہ چکے تھے اور نصب العین کے ساتھ ان کے پیمان اور تحریکِ حریت کے ساتھ ان کی بے پناہ اور پُر خلوص وابستگی کی وجہ سے انہیں فریقِ مخالف کے ہاتھوں غیر معمولی تکالیف اور جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا تھا اور اس معاندانہ صورت حال سے بچنے کے لئے سرینگر کے اپنے آبائی محلے سے نقلِ مکانی کر کے میر واعظ منزل کے بالمقابل نالہ مار کے مشرقی کنارے پر آباد محلہ سیف الدین پورہ میں آکر رہنے لگے تھے۔ ہجرت کا یہ واقعہ تقسیمِ ریاست سے پہلے ہی پیش آیا تھا اور میرے والد کو اپنا لڑکپن میر واعظ خاندان کے بعض ہم عمر اراکین بالخصوص میر واعظ مولوی محمد احمد کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا تھا۔ دونوں ہم تعلم بھی رہے تھے اور میر واعظ محمد فاروق اس حقیقت کا بھرپور ادراک رکھتے تھے۔

میر واعظ محمد فاروق کو سننے اور یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی ہے بلکہ تیر نشانے پر لگ چکا ہے کیونکہ خود انہوں نے استدلالی انداز ہی میں سہی یہ یقین دلایا کہ غلطیوں کا ازالہ کیا جائے گا۔ میں مضمون ''جامع مسجد چلیں'' کی دوسری قسط کو مطبوعہ شکل میں دیکھنے کے لئے بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ لیکن جب ایک ہفتے کے توقف کے باوجود وہ آفتاب میں نظر نہیں آئی تو میں نے اس کی وجہ جاننے کے لئے اخبار کے دفتر کا رُخ کیا۔

میں ابھی سرینگر کے سری پرتاپ ہائیر سکینڈری اسکول میں زیرِ تعلیم ہی تھا جب میں نے مقامی اخبارات کے لئے مضامین اور مراسلے تحریر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ورطۂ تحریر میں لائے گئے میرے خیالات اور نثر پارے عموماً آفتاب میں ہی شائع ہوتے تھے۔ اگر چہ میں خواجہ صاحب سے کبھی نہیں ملا تھا چند برس پہلے میں نے انہیں قریب سے ضرور دیکھا تھا جب وہ اپنے دفتر سے نکل رہے تھے اور اس شخص پر گرجے جو بڈشاہ ہوٹل کے اندرونی احاطے میں کھڑا ہو کر دسویں جماعت کے امتحان کے نتائج کا گیزٹ ہاتھ میں لے کر امیدواروں کے پاس یا فیل ہونے کی منادی کر رہا تھا۔ جن طلبہ کو کامیاب ہونے کی نوید سنائی جاتی تھی وہ ان سے ایک روپیہ بطور اجرت یا معاوضہ لیتا تھا۔ میں ادائیگی کرنے ہی والا تھا کہ خواجہ صاحب کے گرجنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی وہ شخص وہاں سے رفو چکر ہو گیا اور ہم اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ جب ہم نے اسے لال چوک کی ایک گلی میں پکڑ لیا تو اس نے ہمیں بتایا کہ اس پر گرجنے والا شخص ''شنہ آفتاب'' ہے اور غالباً اس کے دفتر کے بغل میں ہماری موجودگی سے زیادہ وہ شور و غل اور بے ہنگم آوازیں ان کے لئے باعثِ کوفت بنی تھیں جو اس زمانے میں اس طرح کے کسی بھی مجمع کا لازمی حصہ ہوتی تھیں۔

خواجہ صاحب اب ایک باریش بزرگ نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنے بال بھی بڑھا لئے تھے اور درویشوں سا حلیہ رکھتے تھے۔ ایک دِن مجھے اپنی میز کے سامنے کھڑا دیکھ کر مجھے گھورنے لگے اور پھر مجھ سے یوں مخاطب ہوئے۔ ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کئی توقف کے

بغیر جواب دیا...... ''میں بڑی باقاعدگی کے ساتھ آپ کے اخبار کے لئے مضامین وغیرہ لکھتا ہوں۔ میں انہیں شائع کرنے کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں لیکن اس سے بے حد کوفت محسوس ہو رہی ہے کہ میری ایک تازہ کاوش کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ میرے اس مضمون کے ایک حصے کو شائع کیا گیا لیکن کئی دِن گزرنے کے باوجود دوسرا حصہ اخبار میں نظر نہیں آرہا ہے حالانکہ پہلی قسط کے آخر پر ''باقی کل'' درج تھا۔ میں وجہ جان سکتا ہوں؟'' اپنی شاہین نما آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے اس استفسار کے بعد کہ میرے مضمون کی شہ سرخی کیا تھی خواجہ صاحب نے مجھے یقین دلایا'' گھبراؤ مت مضمون کا باقی حصہ بہت جلد اخبار میں شائع ہوگا۔''

ایسا ہوا نہیں اور جب چند روز کے بعد میں دوبارہ خواجہ صاحب سے ملنے گیا یہ جاننے کے لئے کہ ایک بڑے اخبار کا کہنہ مشق مدیر اپنے وعدے کو وفا نہ کرسکا اور آفتاب سے ایک ایسی حرکت کا ارتکاب کیونکر ہوا جو میری دانست میں ایک پیشہ ورانہ غلطی تھی تو انہوں نے مجھے آئندہ ایسے ''تُند'' مضامین یا، اِسلے لکھنے سے اجتناب کرنے کی صلاح دی۔ انہوں نے کہا'' اگر میں نے پہلے تمہارا مضمون دیکھا ہوتا تو میں اسے شائع کرنے کی ہرگز اجازت نہ دیتا۔'' انہوں نے اس ''چُوک'' کے لئے رتن پوری کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ اس موقع پر مجھے یہ پتہ چلا کہ غلام نبی رتن پوری صاحب آفتاب میں مدیرِ معاون کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں لیکن کئی دنوں سے دفتر نہیں آرہے ہیں۔

اس غیر متوقع دھتکار سے مجھے ذہنی پریشانی ہوئی لیکن میرے رخصت ہونے سے پہلے خواجہ صاحب پوچھنے لگے کہ کیا میں صحافت کو ایک پیشے کے طور پر اختیار کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں، میں نے جواباً کہا'' جی بالکل'' اور انہیں متاثر کرنے کے لئے اپنے مشاغل کی پوری تفصیل ان کے سامنے رکھ دی۔ میں مقامی اخبارات کے علاوہ خلیج ٹائمز، بلٹز، بمبئی اور منصف (حیدرآباد دکن) کے لئے بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ لکھتا تھا۔ جب میں نے اپنی روداد پوری کردی تو خواجہ صاحب کہنے لگے۔ ''مجھے اس سے غرض نہیں کہ تم کیا کیا کرتے ہوئے لیکن میں دیکھ سکتا

ہوں کہ تم میں اونچی اُڑان بھرنے کی صلاحیت موجود ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں ایک بھرپور موقع فراہم کیا جانا چاہیئے۔'' انہوں نے مجھے آفتاب کے ادارتی شعبے میں کام کرنے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کیا لیکن ان سے استدعا کی کہ چونکہ میں ابھی مروجہ تعلیم ہی حاصل کر رہا ہوں اس لئے میرے لئے ہر روز دفتر میں حاضر ہونا ممکن نہ ہوگا۔ نیز دن کی بجائے میرے لئے شام کے اوقات میں کام کرنا زیادہ آسان ہوگا۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں جتلایا۔

میں نے آفتاب میں تقریباً ساڑھے چار برس گزارے۔ اس عرصے کے دوران میں نے عملی صحافت کے اسرار و رموز جاننے کی بھرپور کوشش کی اور اپنی تصنیفی استعداد کو جلا بخشنے کے لئے کسی بھی [illegible] نہ جانے دیا۔ خواجہ صاحب نے اس محاذ پر میری ہر مرحلے پر بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ وہ مجھے بڑے بڑے واقعات، کیفیات، واردات اور اخباری کانفرنسوں کی وقائع نگاری کرنے کا کام تفویض کرتے رہے۔ ان میں کشمیر کی قدآور شخصیات وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دستِ راست مرزا محمد افضل بیگ اور سید قاسم کی طرف سے بلائی گئی پریس کانفرنسیں بھی شامل تھیں۔ سرینگر کے مولانا آزاد روڈ پر واقع ضیافت کدے پر نامہ نگاروں کے ساتھ ایک رسمی گفتگو کے دوران میں نے شیخ صاحب سے ایک سوال پوچھا جو انہیں بظاہر اچھا نہیں لگا، اس لئے اس کا براہِ راست جواب دینے کے بجائے یہ صلاح دی کہ میں شام کو گھر لوٹنے پر اپنے والد سے اس بارے میں استفسار کروں۔ میرے لئے ان کا یہ ردِ عمل غیر متوقع تھا۔ مجلس میں قہقہہ لگا اور مجھے نشانہ تضحیک بنایا گیا۔ اگلے دِن سرکردہ صحافی جگن ناتھ ستھو نے ان کے سامنے اس واقعے کا ذکر کیا۔ میں پریشان ہوگیا اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کشمیر کے سب سے بڑے لیڈر جو وزیرِ اعلیٰ کے منصب پر فائز تھے کے ساتھ یہ جسارت شاید انہیں پسند نہ آئی۔ لیکن مجھے ان سے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ ''اپنا کام جاری رکھنا لیکن دوسروں کے ساتھ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آنے کو اپنا شعار بنائے رکھنا۔'' چند برس کے بعد جب میں آفتاب کو چھوڑ چکا تھا اور اب ایک آزاد پیشہ صحافی کی حیثیت سے سرگرم تھا، ایک روز شیخ صاحب

کا انٹرویو لینے ان کے دفتر پہنچا (یہ میرا ان سے لیا گیا پہلا اور آخری خصوصی انٹرویو ثابت ہوا) تو مجھے دیکھتے ہی وہ پوچھنے لگے...... ''اس دن اپنے ڈیڈی سے پوچھا تھا کہ میری اور مہاراجہ کی حکومت میں انہیں کوئی فرق نظر آتا ہے یا نہیں؟''

شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے تعلقات میں دراڑ پڑ چکی تھی۔ بیگ صاحب کو لگ رہا تھا کہ وہ جس شخص کے پیچھے برسوں تک چلے تھے اور جس کی قیادت اور دوستی پر انہیں ہمیشہ ناز رہا ہے وہ ان سے بے رخی کے ساتھ پیش آ رہا ہے۔ دوسری جانب شیخ صاحب کو لگ رہا تھا کہ نئی دہلی تاریخ کو دہرانے کے لئے پر تول رہی ہے اور بیگ صاحب کو وہی کردار ادا کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو کبھی بخشی غلام محمد نے نبھایا تھا۔ خواجہ صاحب نے مجھے بیگ صاحب سے ملنے کے لئے کہا میں ان سے ان کی راج باغ سرینگر والی رہائش گاہ پر ملا، جہاں مجھے پتہ چلا کہ وہ اس باہمی نزاع کے بارے میں آفتاب کی کوریج سے بے حد خفا ہیں۔ انہوں نے آفتاب میں خبروں کی تحریر کو یک طرفہ قرار دے دیا تاہم وہ مجھے انٹرویو دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اس کے دوران انہوں نے شیخ صاحب کو سخت تنقید کا ہدف بنایا۔ خواجہ صاحب نے مضمرات کی پرواہ کئے بغیر اس انٹرویو کو آفتاب میں من و عن صفحۂ اوّل کی پہلی خبر کے طور پر شائع کیا۔ خبر نے کشمیر کے سیاسی حلقوں میں ہلچل ضرور پیدا کر دی لیکن یہ وقتی ابال ثابت ہوا۔ بیگ صاحب نے جو کچھ کہا تھا شیخ صاحب نے اسے بالکل خاطر میں نہیں لایا۔ اونٹ کونسی کروٹ بیٹھا تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

غلام نبی رتن پوری پہلے ہی آفتاب کو خیر باد کہہ چکے تھے اور میں متوقع استعداد کی حیثیت سے طاہر محی الدین کے ساتھ جُتا تھا جو میرے سینئر تھے۔ خالد بشیر احمد بھی ہم رکاب و ہم صفیر ہو گئے جبکہ محمد یوسف مسکین، غلام جیلانی خان اور خواجہ غلام محی الدین علاقہ بند، جو سرکاری ملازم تھے، شام کے اوقات میں خبروں کی ترتیب میں ہماری مدد کرتے۔ خواجہ صاحب کے ساتھ میرا بڑھتا ہوا قرب بعض ساتھیوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ میرے علاوہ کئی دوسرے ساتھیوں نے

خواجہ صاحب کی پہلی تصنیف ''کشمیر...... ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک'' کا مسودہ تیار کرنے میں ان کی مدد کی تھی لیکن انہوں نے کتاب کے پیش لفظ میں میری محنتِ شاقہ کا اعتراف کیا جو بعض لوگوں کو ناگوار گزرا۔

ایک دن خواجہ صاحب خوش نویسوں کے کمرے میں وارد ہوئے اور میرے متعلق یہ اعلان کردیا کہ آج سے جو بھی مجھے میرے خاندانی نام (شاہ صاحب) کے ساتھ پکارے گا اسے ان کے یعنی خواجہ صاحب کے غیض وغضب کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا ہوگا۔ قلمی نام (جمیل) جو بلانے یا پکارنے کو لازمی قرار دے دیا۔ میرے ساتھی مجھے اعلانیہ خواجہ صاحب کا چہیتا کہنے لگے اور بعض کے لئے میں خارِ چشم بن گیا۔ تاہم بعض نے جن میں میرِ خطاط سید شبیر احمد رضوی اور غلام رسول جو آفتاب کے قدیم ترین ملازمین میں شامل تھے، نجی اور بے تکلف گفتگو کے دوران مجھے خواجہ صاحب کے مزاج کی بے ثباتی اور ان کی ذات کے اندر پائی جانے والی آویزشوں سے باخبر کرادیتے۔ انہوں نے مجھے متنبہ کیا کہ میں خواجہ صاحب کی انا کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کبھی نہ کروں۔

میں نے خواجہ صاحب کے ساتھ ٹکراؤ کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آفتاب کا ایک تنخواہ دار ملازم ہونے کے ناطے ہمیشہ منکسر رہنے کو ترجیح دی اور معینہ حدود سے باہر قدم رکھنے کی غلطی نہیں کی۔ لیکن تاریخ کو اپنے آپ کو دہرانا تھا اور یہ دہرا کر رہ گئی۔ خواجہ صاحب میرے کام میں کیڑے نکالنے لگے اور بہت جلد میں نے خود کو ایک کٹھن صورتِ حال سے دوچار پایا اور میرے لئے یہ فیصلہ کرنا بے حد مشکل نظر آرہا تھا کہ مجھے آفتاب کو خیر باد کہنا چاہیئے یا غیر معمولی نفسیاتی دباؤ میں کام کرتے رہنا چاہیئے۔ خواجہ صاحب کو ذاتی زندگی میں تلخ تجربات سے گزرنا پڑا تھا جو ان کے رویہ اور طور طریقہ پر اثر انداز ہو چکا تھا یہ سوچ سوچ کر میں اپنے آپ کو حوصلہ دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے سامنے یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ افراد اور مسائل کے معاملے میں خواجہ صاحب کے خیالات میں تغیر آنا کوئی انہونی بات نہیں، یہاں تک وہ اپنے ان دوستوں

پر بھی پل بھر میں برستے تھے جنہوں نے ان کی صحبت میں کئی دہائیاں گزاری تھیں۔ جب وہ ان کو بخشنے کے لئے تیار نہیں تھے تو میں نے اپنے آپ کو کسی شمار وقطار میں نہ سمجھتے ہوئے ان کی ہر تند و تلخ بات اور سرزنش کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی سعی کی۔ بعض اوقات میری دانست میں وہ غلط ادارتی فیصلے لیتے تھے بالخصوص خبروں کا انتخاب کرنے میں آفتاب سے کوتاہیاں سرزد ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی بات پتھر کی لکیر ہوتی تھی اور ان کا ہر فیصلہ آخری ہوا کرتا تھا اور کسی میں اسے چیلنج کرنے کی جرأت نہ تھی یا پھر ان کے سامنے اس کا اظہار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ ایک دن میں کسی طرح ان کی ڈانٹ کو برداشت نہ کر سکا اور خفت محسوس کرتے ہوئے آفتاب کے ایک پرانے خطاط اسد اللہ خان سے جو اسی وقت خواجہ صاحب کو دیکھنے کے لئے وہاں آئے تھے، یہ درخواست کر بیٹھا کر وہ انہیں یعنی خواجہ صاحب کو سمجھائیں، میرا اتنا کہنا تھا کہ خواجہ صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ غصے سے ان کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ انہوں نے اپنی میز سے قراقلی ٹوپی اور 555 برانڈ کا سگریٹ پیکٹ اٹھالیا اور پھر دفتر سے باہر چلے گئے۔ تین دن تک وہاں نظر نہیں آئے۔ بعد میں مجھے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ خواجہ صاحب کو میرا ایک ایسے شخص کے سامنے مقابل ہونا بہت برا لگا تھا جو کئی ایک کم مایہ افراد ہی کی طرح ان کے نزدیک قابلِ اعتنا نہیں تھا۔ خواجہ صاحب کے ایک دیرینہ دوست پیرزادہ نظام الدین قریشی کو جب اس واقعے کا علم ہوا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میں صورہ میں واقع ان کے دولت خانے پر جا کر ان سے ملوں اور معافی مانگوں۔ یہ اتوار کا دن تھا، جب میں خواجہ صاحب کے ذاتی کمرے میں داخل ہوا تو وہ اور قریشی صاحب محوِ گفتگو تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خواجہ صاحب نے اپنے گھریلو ملازم کو آواز دی کہ وہ میرے لئے قہوہ بنائے۔ میں ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا اور پھر پوچھنے لگا۔ ''میں آپ کا ملازم ہوں یا آپ میرے ملازم ہیں؟'' ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے ان سے یہ بھی کہا، ''اگر آپ کو میں پسند نہیں یا آپ میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں آپ مجھے سبکدوش کر سکتے ہیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ

یوں دفتر چھوڑ کر کیوں چلے گئے اور پھر تین دن گزرنے کے باوجود وہاں نہیں آئے۔ میں اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا تھا حالانکہ قریشی صاحب بار بار اشارہ کر رہے تھے کہ میں چُپ ہو جاؤں۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کا مرتکب ہو رہا ہوں تو میں نے معذرت چاہی۔ خواجہ صاحب کہنے لگے ''جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ......'' انہوں نے خانساماں کو میرے لئے دوپہر کا کھانا تیار کرنے کا حکم دے دیا۔

صورتِ حال میں بہتری عارضی ثابت ہوئی۔ ہمارے تعلقات میں نئی تلخیاں پیدا ہونے لگیں۔ میں کئی ایک ناخوشگوار واقعات کو فراموش کرتا گیا اور خواجہ صاحب میں ایک ایسے شخص کو دیکھنے کی کوشش کی جسے قابو میں رکھنا یا اپنی پسند اور ناپسند کا پابند بنانا آسان نہیں۔ خواجہ صاحب اکثر مجھے مغرور ہونے کا طعنہ دیتے تھے۔ بہت جلد حالات نے ایک ایسی کروٹ لی جو ہمارے بیچ ایک ایسی دیوار کھڑا کر گئی جسے پاٹنا ناممکن بن گیا۔ لیکن یہ خواجہ صاحب تھے جنہوں نے میری راہ آسان بنا دی۔ میں ان کی اجازت سے ایک ماہ کی رخصت پر چلا گیا تا کہ پاکستان میں دو تین ہفتے گزار سکوں اور اس سے پہلے مدراس میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی ایک کانفرنس میں شریک ہو سکوں۔ میرے سفر پر روانہ ہونے کے ایک دِن بعد انہوں نے اخبار کی پرنٹ لائن سے میرا نام ہٹا دیا تھا۔ مجھے چونکہ پاکستان کا ویزا نہیں ملا میں دو ہفتے بعد ہی جموں کے راستے سرینگر لوٹ آیا۔ جموں میں ستھو صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ ''مجھے آفتاب سے نکال دیا گیا ہے۔''

سرینگر پہنچ کر طاہر محی الدین نے مجھے بتایا کہ میرے رخصت پر جانے کے اگلے دِن صحافی بنسی لال کاک نے خواجہ صاحب کو بتایا کہ میں نے ان سے اپنے سفر کے مقصد کے بارے میں جھوٹ بولا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میری خلیج ٹائمز میں معاون مدیر کی حیثیت سے تقرری ہوئی ہے اور میں وہاں چلا گیا ہوں۔ کاک صاحب اور دیگر لوگوں نے بارہا میری حوصلہ شکنی کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے صحافت کے پیشے میں آ کر ایک بہت بڑی غلطی کی ہے۔ انہوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اپنا وقت مزید ضائع کئے بغیر سرکاری ملازمت حاصل کروں جیسا کہ خالد

بشیر احمد اور رتن پوری کر چکے ہیں۔ کاک صاحب نے ایک بار کہا تھا کہ اس بات کے لئے پچھتا رہے ہیں کہ خود انہوں نے صحافت کا پیشہ کیوں اختیار کیا اور مجھے خبردار کیا کہ وقت تیزی کے ساتھ ہاتھ سے نکل رہا ہے۔

جب میں خواجہ صاحب سے ملا تو مجھے لگا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں پہلے ہی آفتاب کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ہم خوشی خوشی جدا ہو گئے۔

جون ۱۹۹۰ء کو مجھے گرفتار کیا گیا اور اذیت خانہ میں رکھا گیا۔ دریں اثناء سرینگر میں عہدیداروں نے یہ اعلان کیا کہ مجھے عسکریت پسندوں نے اغوا کر لیا ہے۔ میرے عزیز و اقارب میری لاش کا انتظار کرنے لگے لیکن جب مجھے فوج نے اگلے دِن رہا کیا تو میں سرینگر کے الٰہی باغ علاقے میں اپنے والدین سے ملنے گیا جنہوں نے میری گرفتاری یا اغوا کے بعد کے لمحات بڑی بے چینی میں گزارے تھے۔ میری والدہ نے میرے ماتھے کو چوما اور پھر کہنے لگیں "اتنے بے مروّت نہ بنو"۔ میں نے دریافت کیا کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ انہیں ایسا کہنا پڑ رہا ہے۔ وہ کہنے لگیں "میں نے سنا ہے کہ خواجہ صاحب ننگے پاؤں تپتی دھوپ میں صحافیوں کے اس جلوس کی قیادت کر رہے تھے جو تمہاری رہائی کے مطالبے کو لے کر (سرینگر میں) اقوام متحدہ کے فوجی مبصرین کے دفتر تک گیا تھا۔"

میں فوٹو گرافر حبیب اللہ نقاش کے ہمراہ سیدھے خواجہ صاحب سے ملنے گیا اور انہیں ایسا ہی پُرتپاک اور خلیق پایا جیسا اچھے دنوں کے دوران انہیں دیکھا اور جانا تھا۔ ایک پیشہ ور صحافی کی حیثیت سے وہ طرزِ جدید کے نقیب تھے۔ انہوں نے جو بھی نئے نئے تجربات کئے وہ کامیاب رہے اور آفتاب کی مقبولیت کا باعث بنے۔ انہوں نے لوگوں کی اچھے صحافی اور مصنف بننے میں بھرپور معاونت کی یا یوں کہیئے کہ راہنمائی کی۔ لیکن ان کی آزردگی کا یہ نتیجہ تھا کہ آفتاب ان لوگوں کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ نہ کر سکا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض لوگوں نے آفتاب کو محض

ایک حدت ناپذیر چبوترہ کے طور پر استعمال کیا جس کی خواجہ صاحب اکثر شکایت کرتے تھے۔

ایک بشر کی حیثیت سے وہ آمیزۂ نور و نار تھے۔آفتاب کے ساتھ میری عملی وابستگی ختم ہو جانے کے ایک دن بعد جب میں جنزل منیجر عبدالسلام کے دفتر میں ان کا اس لئے انتظار کر رہا تھا کہ طے شدہ معاہدے کے تحت ضروری کاغذی لوازمات کو پورا کیا جاسکے تو خواجہ صاحب وہاں آگئے اور مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگے......'' آپ کون ہیں؟ آپ کو کیا چاہیئے؟ یہاں کس لئے آئے ہیں؟''...... میں نے آفتاب میں ساڑھے چار سال گزارے تھے اور تقریباً یہ تمام عرصہ خواجہ صاحب کے بالکل قریب رہ کر گزارا تھا۔

جب میری شادی ہو رہی تھی خواجہ صاحب نے ہمارے گھر آکر مجھے گلے لگایا اور پھر (مرحوم) صوفی غلام محمد اور (مرحوم) قیصر مرزا کی موجودگی میں قرآنِ مجید کا ایک نسخہ تحفتاً پیش کرتے ہوئے اصرار کیا کہ وہ مجھے خود دلہن کے گھر تک لے جائیں گے۔وہاں انہوں نے اسے بھی قرآن مجید کا نسخہ تحفے کے طور پر پیش کیا اور کہا......''میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے بیٹے کی شریک حیات پانے کا شرف کسے حاصل ہو رہا ہے'' ہمارے حق میں دُعائے خیر کرنے کے بعد وہ وہاں سے بنا کچھ کھائے پیئے چلے گئے۔



☆...... خالد بشیر احمد

آفتاب اور خواجہ صاحب

کشمیر یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد میرے لئے ابھی روزگار کا وسیلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۹ء کا سال تھا۔ کالم نگار جی۔ایم زاہد اُن دنوں محکمۂ اطلاعات میں مُلازم تھے۔ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ منظور کے دوست ہیں اور اِس ناطے میرے بھی اُن سے مراسم تھے۔ ایک دن اُنہوں نے کہا کہ روزنامہ ''آفتاب'' کو ادارتی عملے کے لئے ایک نوجوان کی تلاش ہے جسے اُردو زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہو اور صلاح دی کہ مجھے وہاں جانا چاہیے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ مجھے اُن صاحب سے ملائیں گے جنہیں مدیر آفتاب نے ایسا کوئی نوجوان تجویز کرنے کو کہا تھا۔ میں نے حامی بھرلی۔ چنانچہ میں اُن کے دفتر گیا جہاں سے اُن کے افسر مظفر احمد خان مجھے ادارہ ''آفتاب'' لے گئے اور مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ سے متعارف کرایا۔

خواجہ صاحب سے میری پہلی مُلاقات تھی حالانکہ روزنامہ 'آفتاب' کے قارئین کے لئے میں غیر متعارف نہیں تھا۔ میرا اور 'آفتاب' کا رشتہ سات سال قبل جُڑا تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو جب میں ایس پی کالج کا طالب علم تھا، میری پہلی کہانی 'انوکھا مِلن' روزنامہ آفتاب میں چھپ گئی۔ وہ لمحہ آج بھی میرے حافظے میں تازہ ہے۔ اُن دنوں ہمارے یہاں اخبار یا تو عبدالخالق مرحوم کے سیلون میں آتا تھا اور یا پھر مرحوم کمال صوفی کی دُکان پر۔ سیلون میں جاکر اخبار پڑھنا میری ہمّت سے باہر تھا کیونکہ وہاں محلّہ کے تمام بڑے اور بُزرگ حُقّے کے کش لے لے کر 'آفتاب' کا پرچہ باری باری پڑھتے اور چٹخارے لے لے کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے

رہتے۔ اِس محفل میں مجھ جیسے نوجوان کا جانا اور اخبار مانگ لینا حدِ ادب سے باہر تھا۔ میں حسبِ معمول صبح سویرے روٹیاں لینے بازار گیا اور نانبائی کی دُکان پر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار کا ہاکر 'آفتاب' کا پرچہ دُکان پر چھوڑ گیا تھا اور مرحوم کمال صوفی کا فرزند فاروق احمد اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں اِس انتظار میں تھا کہ کب وہ مطالعہ ختم کرے اور میں اُس سے اخبار مانگ کر پڑھ لوں۔

کچھ دِن قبل میں نے ایک کہانی لِکھ کر 'آفتاب' میں اشاعت کے لئے بھیجی تھی اور اب مجھے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب کہانی اخبار میں شائع ہو۔ جب اخبار میرے ہاتھوں میں آیا اور پہلے صفحے پر سرسری نظر ڈال کر میں نے اخبار کا ورق اُلٹا تو نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا بلکہ پورے جسم پر عجیب قسم کی کپکپی چھا گئی۔ یہ خوشی کا کیسا احساس تھا مجھے آج تک معلوم نہیں۔ اُن دِنوں 'آفتاب' چار صفحات پر شائع ہوتا تھا اور دوسرے صفحہ کے دو تہائی حصّے پر میری کہانی چھپی تھی، 'انوکھا مِلن' تحریر خالد بشیر، سونہ وار سرینگر۔ یہ ادبی دُنیا سے میرا پہلا تعارف تھا۔ اُس کے بعد میری کہانیاں متواتر 'آفتاب' میں چھپیں اور پھر جب میرا میلان شاعری کی طرف بڑھا تو میری غزلیں اور نظمیں بھی پہلے پہل 'آفتاب' کی وساطت سے ہی سامنے آئیں، یہ وہ زمانہ تھا جب 'آفتاب' نے کشمیر کی ادبی دُنیا سے کئی نام متعارف کرائے تھے۔ اُن دِنوں جو اصحاب تواتر سے چھپتے تھے ان میں عمر مجید، م۔م صدیق اور ایس ایم قمر تینوں میرے محلہ سونہ وار سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن کے مقابلے میں، میں نو آموز تھا۔ بشیر گاش، شمس الدین شمیم، محمد یعقوب بافندہ، ایم نساء، یٰسین فردوسی، نذیر مشتاق بڑی باقاعدگی کے ساتھ چھپتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی نام تھے جنہیں اِس وقت میں بھول رہا ہوں۔ اُمید ہے میرے وہ دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔

بہرحال مُجھے ادارہ 'آفتاب' میں رکھا گیا اور اولاً خبر رساں ایجنسی یو این آئی اور پی ٹی آئی کی کچھ خبریں ترجمہ کرنے کو دی گئیں۔ میں نے فوراً ترجمہ خواجہ صاحب کے پاس بھجوا دیا۔ خواجہ صاحب نے سُرخیاں جما دیں اور خبریں اخبار میں چھپ گئیں۔ اُن دِنوں بڈشاہ چوک میں

اخبار کا دفتر جیسا کہ شاید آج بھی ہے، تین کمروں اور ایک رہداری پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں ادارے کا منیجر اور دیگر سٹاف، دوسرے میں مدیر آفتاب اور تیسرے میں اخبار کے خوشنویس حضرات بیٹھے تھے۔ ادارتی عملے میں طاہر محی الدین اور یوسف جمیل مستقل ارکان تھے۔ یوسف جمیل خواجہ صاحب کے بالمقابل بیٹھتے تھے اور خبروں اور دیگر کالموں کیلئے خواجہ صاحب سے ڈکٹیشن بھی لیتے اور خود بھی خبریں تیار کرتے۔ طاہر محی الدین راہدری میں براجمان تھے اور میری نشست بھی وہیں مقرر ہوئی۔ یوسف جمیل اُن دِنوں خواجہ صاحب کے خاص الخاص تھے۔ اُن کی بات کا پاس رکھا جاتا تھا۔ اِس سے قبل طاہر محی الدین کو یہ مرتبہ حاصل تھا جبکہ اُن سے قبل غلام نبی رتن پوری اِس منصب پر فائز تھے۔ رتن پوری میرے ادارہ جوائن کرنے سے قبل ہی وہاں سے جا چکے تھے۔ چنانچہ طاہر محی الدین کہا کرتے تھے کہ اگر یوسف جمیل خواجہ صاحب سے کہے کہ کل چھٹی کریں گے تو سمجھو کل چھٹی ہے۔ بہر حال، مجھے آفتاب میں ایک اچھا اور دوستانہ ماحول میسّر ہوا۔ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل دونوں شفقت کی حد تک مُجھ سے مانوس ہوئے۔ طاہر محی الدین کا قلم اپنے شباب پر تھا۔ اُن کے تجزیاتی کالم پیشہ ورانہ ہوتے تھے۔ یوسف جمیل کی شرافت اور قابلیت دونوں مُسلّم تھیں۔ اوّل الذکر سیاست پر خامہ فرسائی کرتے تھے جبکہ آخر الذکر زیادہ تر اسلامی اور فلمی صفحات ترتیب دیتے تھے۔ اُن کے ذمّہ اتوار کو شائع ہونے والا بارہ صفحات کا Tabloid سائز ہفتہ وار شمارہ بھی تھا۔ میں بھی اس کے لئے خبروں کے علاوہ مضامین اور فیچر لکھتا تھا۔

خوشنویسوں میں محمد رمضان، غلام رسول، شبیر احمد رضوی مرحوم، بشیر احمد، غلام محمد ڈار اور غلام قادر مُستقل خوشنویس تھے۔ جبکہ محمد صدیق، موتی لال اور محمد یوسف مسکین بھی خوشنویسی کا کام انجام دیتے تھے۔ مرحوم شبیر احمد ہیڈ کاتب تھے اور اخبار کے بالائی نصف کی کتابت کرتے تھے۔ اللہ مغفرت کرے وہ کمال کے خُوشنویس تھے۔ بشیر احمد کے ذمّہ صفحۂ اوّل کا زیریں نصف تھا۔ کشمیر کے پہلے فوٹو جرنلسٹ محمد امین بھی اُن دِنوں اِدارہ سے وابستہ تھے۔ منیجر عبدالسلام 'آفتاب' کے اہم رُکن تھے اور افسانے کی آمیزش سے واقعات کو چٹخاروں کے ساتھ پیش کرنا

اُن کا خاصا تھا۔ اُن کے ماتحت کلرک غلام نبی تھے جو شاید اب تک ادارے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک اور پنڈت کلرک تھے جن کا نام اب میرے حافظے میں نہیں ہے۔ جی' احمد کارٹونسٹ تھے اور مضامین اور فیچرس کے لئے خاکے بناتے تھے۔ خواجہ صاحب کے معتمدین میں نظام الدین قریشی، عبدالحمید خان اور غلام محمد پان والا تھے جنکا دفتر 'آفتاب' میں روز کا آنا جانا تھا۔

میرے ادارہ 'آفتاب' میں آنے کے تیسرے یا چوتھے روز خواجہ صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں راہدری میں نکلنے والے دروازے سے اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ غالباً وہ اُس وقت اکیلے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مُجھ سے مخاطب ہوئے "میں نے تمہارا کام دیکھا' تین دن میں ہی تُم نے اچھی طرح سے pick-up کیا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرو کہ آیا تم یہاں کام کروگے۔"؟ میرے لئے یہ الفاظ بے حد حوصلہ افزا تھے۔ چنانچہ مُجھ میں اعتماد ظاہر کرنے پر میں نے اُن کا شُکریہ ادا کیا اور جواباً عرض کیا کہ میں کام کرنے کی غرض سے ہی آیا ہوں" یہ کہہ کر میں واپس اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں لیکن شاید جون کا مہینہ تھا جب میں ادارہ 'آفتاب' کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔ یہ غالباً وسط ماہ تھا۔ اختتام ماہ پر جب عملے کو اپنے کام کا محنتانہ دیا گیا تو میں اُن میں شامل نہیں تھا۔ میں نے کسی سے پوچھا بھی نہیں کہ کیوں؟ البتہ اگلے ماہ کے اختتام پر مجھے دوسو روپے تنخواہ دی گئی۔ میرے حساب سے یہ ایک قلیل رقم تھی لیکن میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔

بچپن سے ہی کہ جب سے میں روزنامہ 'آفتاب' پڑھتا تھا خواجہ ثناء اللہ بٹ کی شخصیّت کا ایک اسطوری خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ اصل میں اُن دِنوں کشمیر کی صحافت میں اِسی نام کا سِکّہ چلتا تھا۔ 'آفتاب' محلّہ محلّہ، قصبہ قصبہ پڑھا جاتا تھا اور سرینگر شہر میں تو اُن لوگوں کے لئے جنہیں اخبار خریدنے کی استطاعت تھی، یہ ناشتے کا ایک اہم جز تھا۔ دیگر لوگ اکثر حجاموں کی دُکانوں پر لگنے والی بیٹھکوں میں یا ریستورانوں میں اِس کا مطالعہ کرتے تھے۔ شہر میں خال ہی نائی کی کوئی دُکان ہوگی جہاں 'آفتاب' نہ آتا ہو اور یوں یہ دُکانیں کمیونٹی ریڈنگ روم کے طور استعمال ہوتیں۔ 'آفتاب' میں چھپنے والی خبروں اور مضامین کو لوگ اعتبار کی نظروں سے دیکھتے

تھے یہاں تک کہ 'خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے' ایسے مزاحیہ کالم کو بھی حقیقت تسلیم کر لیتے۔ خواجہ صاحب نے کشمیر کی اُردو صحافت میں جو کام کیا ہے وہ انتہائی قابلِ ستائش ہے۔ کئی معنوں میں تو اُنہوں نے قائدانہ رول ادا کیا ہے۔ مثلاً کشمیر میں گھر گھر اخبار پہنچانے کا عمل خواجہ صاحب کی ہی دین ہے۔ اِس سے قبل اخبار کی ہاکنگ (Hawking) کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آفتاب نے باضابطہ رنرز کو مامور کر کے ترسیلِ خبر کا ایک مُنضبط طریقہ اپنایا۔ یہی نہیں، اِس سے قبل وادی سے جو بھی اخبار جاری ہوئے وہ یا تو ایک ہی فرد یا زیادہ سے زیادہ ایک خاندان کے گرد گھومنے والے اِدارے تھے۔ خواجہ صاحب نے پہلی مرتبہ نامہ نگاروں کا عملہ تعینات کر کے ایک نئی مثبت روایت کی بُنیاد ڈال دی جسے بعد میں انگریزی روزنامہ 'گریٹر کشمیر' نے اداریاتی حیثیت عطا کی۔ 'آفتاب' کی تربیت گاہ سے نکلنے والے کئی اصحاب نے ادب اور صحافت کے میدان میں نام کمایا۔ وادی کی صحافت میں ایک اور سنگِ میل جو روزنامہ 'آفتاب' نے طے کیا وہ اُردو صحافت کو دقیانوسی لتھو پرنٹنگ سے نکال کر جدید آفسیٹ پرنٹنگ سے مُتعارف کرانا ہے۔ یہ ایک خوشگوار تبدیلی تھی جس کا قارئین نے دِل کھول کر استقبال کیا۔

پہلی مرتبہ خبروں کے ساتھ تصویروں کی اشاعت نے وادی کے کثیر الاشاعت روزنامے کو انتہائی دیدہ زیب بنا دیا۔ ایک اور افتخار جو ادارہ آفتاب کو حاصل ہے وہ خبروں کے حصول کے لئے خبر رساں ایجنسیوں کی خدمات حاصل کرنا ہے۔ جہاں اب تک وادی کے اخبار جُز وقتی رپورٹروں، بی بی سی، ریڈیو پاکستان اور ریڈیو کشمیر کی خبروں کے بُلیٹنوں پر منحصر تھے وہاں روزنامہ 'آفتاب' نے پہلی مرتبہ پریس ٹرسٹ آف انڈیا اور یونائیٹڈ نیوز آف انڈیا کی خدمات حاصل کیں جن کا بین الاقوامی خبر رساں اداروں مثلاً رائٹرس اور ایسوسی ایٹیڈ پریس کے ساتھ بھی خبروں کا لین دین تھا اور یوں کشمیر کے کسی اخبار کو یہ پہلا اعزاز حاصل ہوا کہ وہ اپنے قارئین کو عالمی پیمانے پر رونما ہونے والے واقعات کی تازہ ترین خبریں فراہم کرے۔ اِس طرح 'آفتاب' کی مقبولیت کے کئی وجوہ تھے جنہوں نے خواجہ صاحب کی شخصیت کو ایک انفرادی حیثیت عطا کی تھی۔ اِس انفرادیت کی وجہ سے وہ نہ صرف عوام بلکہ سرکاری حلقوں میں بھی عزت واحترام کی

نگاہ سے دیکھے جاتے۔ میں نے ادارہ 'آفتاب' میں اپنے مختصر قیام کے دوران کئی اہم مقامی سیاسی شخصیتوں اور عہدیداروں کو مودبانہ انداز میں خواجہ صاحب کی محفل میں بیٹھے دیکھا ہے۔ عوامی مقبولیت کی وجہ سے روزنامہ 'آفتاب' کو اقتدار کی حد تک اثر ونفوذ حاصل ہوا تھا جس سے اکثر سیاستدان اور عہدیدار مرعوب ہوکر خواجہ صاحب کے حضور حاضری دیتے۔

خواجہ صاحب کے کردار کا ایک اور مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے معاصرین یا مقتدّ مین کے برعکس حکمرانوں اور اصحابِ اقتدار کے پاس نہیں جاتے۔ اکثر اس طرح کے لوگ خود اُن پاس آتے۔ آجکل کس طرح لوگ چھوٹے بڑے فوائد حاصل کرنے کے لئے درِ اقتدار پر صبح و شام حاضری دیتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خواجہ صاحب کبھی کبھار ہی وزرائے اعلیٰ کے پاس گئے ہوں گے۔ یہ مُلاقاتیں، جہاں تک میرا علم ہے، خود حُکمران وقت کی استدعا پر ہی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ روزنامہ 'آفتاب' پر خبروں کی اشاعت کے لئے یا بلیک میلنگ سے پیسے کمانے کا الزام نہیں آیا۔

'آفتاب' میں میرے قیام کے ایام افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت اور قبضے کا دور تھا۔ سوویت استبداد اور ظلم و جبر کے رونگٹھے کھڑا کردینے والے قصے یا تو بی بی سی کے ذریعہ یا مغربی اخباروں اور جرائد کی وساطت سے لوگوں تک پہنچتے تھے۔ روزنامہ 'آفتاب' افغان مجاہدین کی جُرأت اور جوانمردی کے قصّے بڑے چاؤ اور کسی حد تک عقیدت مندانہ طریقے پر شائع کرتا تھا۔ اِس کے پیچھے طاہر محی الدین کی کاوش تھی جو اخبارات اور بی بی سی کے سیر بین پروگرام سے خبریں اکٹھا کر کے قارئین کو سوویت یونین کی پسپائی کی نوید دے رہے تھے۔ اُنہیں افغانستان کا پورا سیاسی اور عسکری جغرافیہ ازبر تھا اور جلال آباد، قندہار، بگرام، خوست وغیرہ میں مجاہدین کے کارناموں کے علاوہ قابض افواج کی مورچہ بندی تک کے تازہ ترین حالات سے آگاہی تھی۔ نور محمد ترا کی، ببرک کارمل، نجیب اللہ، سبغت اللہ مجددی، گلبدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود، عبدالرشید دوستم وغیرہ ناموں کو کشمیر میں گھر گھر تک لیجانے میں بی بی سی کے بعد 'آفتاب' کا دخل تھا۔ غرض افغان مجاہدین کی گولہ باری کے ساتھ 'آفتاب' کے لفظی گولے بھی سوویت فوج

کو پسپا کر رہے تھے۔

اِنہی دِنوں جو کہ 'آفتاب' میں میرے ابتدائی ایام تھے امریکی جریدے 'ٹائم' میں افغانستان پر سوویت حملے اور سُرخ فوج کی عسکری قوت کے بارے میں ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اِس مضمون کو اخبار میں نقل کرنا چاہتے تھے چنانچہ ترجمے کا کام مجھے سونپا گیا۔ میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں یہ کام کر کے دیا جس نے اُن کی نظروں میں میری وُقعت بڑھا دی۔ دوسرے روز یہ مضمون اخبار کے صفحہ اوّل پر شائع ہوا لیکن ترجمہ نگار کا کوئی ذِکر نہیں تھا۔ بہر حال، مجھے یہ تسلّی رہی کہ یہ کام میں نے ہی کیا ہے۔ اِس کے بعد خواجہ صاحب نے مجھے اپنی زیر ترتیب کتاب 'کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک' کے دو تین ابواب انگریزی میں ترجمہ کرنے کو دیئے وہ کتاب کا انگریزی پرنٹ شائع کرنا چاہتے تھے۔ ترجمے کا کام صحافی ایم ایل کاک کر رہے تھے اور خواجہ صاحب کی نظر میں یہ تین ابواب بڑے **Explosive** تھے جنہیں وہ کاک صاحب کو دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں ایک باب پر میشوری کے قبولِ اسلام اور پنڈت ایجی ٹیشن اور دوسرا موئے مقدسؐ تحریک کے بارے میں تھا۔ مجھے ان میں کچھ بھی آتش انگیز نظر نہیں آیا۔ خواجہ صاحب پہلے کتاب کا عنوان 'کشمیر شعلوں کی لپیٹ میں' رکھنا چاہتے تھے بعد میں اِسے بدل دیا۔ اُن کے خیال میں اِس طرح کا عنوان آتش گیر مادہ تھا۔

میرے اوقاتِ کار صبح دس بجے سے رات کو نو بجے تک تھے۔ دن بھر طاہر محی الدین، یوسف جمیل اور میں ٹیلی پرنٹر روم سے اہم خبریں منتخب کر کے اُن کا ترجمہ کرتے اور وادی کے مختلف حِصّوں سے حاصل ہونے والی رپورٹوں اور پریس نوٹس سے خبریں تراش کر مدیرِ آفتاب کی میز تک پہنچاتے جو حسبِ ضرورت ایڈیٹنگ کر کے اور سُرخیاں جما کر خوشنویسوں تک پہنچوا دیتے۔ دن کی مشقّت کے باوجود تھکن کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ پورا عملہ ایک دوستانہ ماحول میں کام کرتا تھا۔

میری پہلی **outdoor assignment** ایک پریس کانفرنس تھی جس سے گورنر جموں وکشمیر ایل کے جہا' راج بھون چشمہ شاہی میں خطاب کرنے والے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ

صحافیوں کو محکمۂ اطلاعات کی طرف سے گورنمنٹ پریس بلڈنگ سے راج بھون تک لیجایا جائے گا۔ محکمۂ اطلاعات کے صوبائی دفتر میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بتایا گیا کہ مجوزہ پریس کانفرنس مُلتوی کی گئی ہے۔ اِس کے بعد پہلی بار کسی واقعہ کی رپورٹنگ کرنے کا موقعہ مجھے اُس وقت مِلا جب حکمران نیشنل کانفرنس آنے والے پارلیمانی ضمنی انتخابات کے لئے اپنے اُمیدواروں کا عوامی اجتماع میں اعلان کرنے والی تھی۔ یہ اجتماع مجاہد منزل میں تھا اور ناموں کا اعلان سہ پہر کو خود وزیرِ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کرنے والے تھے۔ ایک بڑا اسٹیج تیار کیا گیا تھا جس پر شیخ صاحب کے علاوہ پارٹی کے دیگر زعماء براجمان تھے۔ مجھے بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ سٹیج پر ہی جگہ مِلی۔ شیخ صاحب کو اتنا قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ وہ کُرسی پر بیٹھے تھے اور اُن کے عقب میں، میں بیٹھا جلسہ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُن کے چہرے اور جسم پر عُمر رسیدگی کے اثرات نمایاں طور پر اُبھرے تھے اور لگ رہا تھا کہ کشمیر کی وادیوں میں دھاڑنے والے پر بوڑھاپے نے اپنا اثر جما دیا ہے۔

میں اِس خیال سے کہ جلسے کی کاروائی کا کوئی حِصّہ نہ چھوٹے، بہت پہلے ہی مجاہد منزل پہنچ گیا تھا اور جب تک کہ جلسہ اختتام پذیر ہوا اور شیخ صاحب نے ڈاکٹر فاروق عبداللہ، غلام رسول کوچک اور مبارک شاہ کو پارٹی کے اُمیدواروں کے طور عوام سے متعارف کرا کے اپنی تقریر ختم کر دی شام رات کی دہلیز پر دستک دے چکی تھی۔ میں جلدی جلدی واپس دفتر پہنچا، شیخ صاحب کی تقریر اور جلسے کی کارروائی پر خبر تیار کی جو نسبتاً طویل تھی اور خواجہ صاحب تک پہنچا کر گھر لوٹا۔ صبح جب اخبار دیکھا تو میری تحریر کردہ خبر 'آفتاب' کی شہ سُرخی تھی اور اِس سے زیادہ حیرت اور مسرت کی بات یہ تھی کہ خبر کے ساتھ کریڈٹ لائن بھی شائع ہوئی تھی۔ 'خالد بشیر، نمائندہ خصوصی' یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اِس طرح 'آفتاب' میں کسی رپورٹر کی کریڈٹ لائن شائع ہوئی ہو۔ وادی سے چھپنے والے دیگر اخباروں کی تو بات ہی نہیں۔ اب تک صرف مضامین، تبصروں، تجزیاتی رپورٹوں یا مُستقل کالموں کے ساتھ ہی مصنف یا کالم نگار کا نام آتا تھا۔ نامہ نگار کی حیثیت سے یہ افتخار میرے حصّے میں تھا۔ خواجہ صاحب میرے کام سے خُوش تھے اس کا احساس

مجھے تھا اور یہ بات بھی صاف تھی کہ مجھ پر اُن کا اعتماد بڑھ گیا تھا۔

اِنہی دِنوں سرینگر میں ریاستی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پہلے ہی دن ایوان میں دھینگا مشتی اور ہاتھا پائی ہوئی۔ جنتا پارٹی کے رہنما عبدالغنی لون کو نیشنل کانفرنس کے ارکانِ اسمبلی نے زدوکوب کیا اور کہا گیا کہ یہ سب کچھ شیخ صاحب کی ایما پر ہوا۔ اخبار کے دفتر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی اور میں تقریباً فراغت میں تھا۔ میں نے قلم اُٹھایا اور یہ قطعہ تحریر کیا

شروع جب ہوگئی قانون سازی
بڑی اُدھم مچائی ممبروں نے
جنابِ شیخ بھی برہم ہوئے جب
لتاڑا لون کو کچھ دلبروں نے

یہ اشعار لکھ کر میں نے طاہر محی الدین کو دِکھائے جو انہیں لے کر خواجہ صاحب کے پاس گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بُلا وا آیا۔ میں کمرے میں گیا تو اُنہوں نے بڑے تپاک کا مظاہرہ کیا اور شاباشی دے کر کہا کہ ''یہ real contribution ہے۔ خبریں وغیرہ تو معمول کی چیزیں ہیں۔'' یہ سُن کر میرا حوصلہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ صبح کے اخبار میں یہ قطعہ اوّلین صفحہ پر میرے نام کے ساتھ زرّیں بکس (box) میں شائع ہوا اور یوں کشمیر کی صحافت میں روزمرّہ کے حالات و واقعات پر مبنی شعری کارٹون کی ابتداء ہوئی جس کی بعد میں کئی اخبارات نے تقلید کی۔ شعری کارٹون سے 'آفتاب' کی مقبولیت میں کوئی اضافہ ہوا یا نہیں لیکن مجھے اچھی خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ قارئین کی پسندیدگی کا feedback کسی نہ کسی طرح تو ملتا ہی تھا۔ اِس سلسلے میں ایک دِل کو چھونے والا اور بڑی دیر تک میرے احساس پر چھائے رہنے والا واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں حسبِ معمول دفتر میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ کسی نے غالباً عبدالسلام نے، اطلاع دی کہ کوئی خاتون باہر ہیں اور تمہیں پُوچھ رہی ہیں۔ میں حیرت اور اشتیاق کے تاثرات لے کر باہر والے کمرے میں گیا تو وہاں ایک پنجابی مُسلم بزرگ خاتون، جو لاٹھی ٹیک کر آئی تھی، منتظر تھی۔ عُمر رسیدہ، چہرے پر جُھریاں اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی محبت جو

صرف ماؤں کا حِصّہ ہے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ میں ہی خالد بشیر ہوں جنہیں تلاش کرتے ہوئے وہ یہاں آئی ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی وہ خاتون والہانہ طور پر مجھ سے ملیں اور میرا ماتھا چوما اور مجھے ڈھیروں دُعائیں دینے لگیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ اُنہوں نے کیا الفاظ کہے تھے لیکن وہ مجھے دُعائیں اور شاباشی دے رہی تھیں، یہ کہہ کر کہ میں یونہی لِکھتا رہوں۔ میرے لئے وہ لمحات نہایت انمول تھے اور یہ ایسی حوصلہ افزائی تھی جو میرے وہم وگماں سے بھی زیادہ تھی اور جس کا اثر بڑی دیر تک باقی رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ خاتون کون تھی لیکن جس شفقت اور محبت کا اُنہوں نے اظہار کیا تھا وہ یقیناً کسی بڑے سے بڑے انعام سے بھی فزوں تھا۔

بہر حال شعری کارٹونوں کو بے حد سراہا گیا' اگرچہ خواجہ صاحب نے قارئین کی پسندیدگی کا مجھ سے کبھی ذِکر نہیں کیا۔ سوائے اُس دن جب شیخ صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ وہ اپنی کابینہ میں وزراء کی تعداد کم کر رہے ہیں اُنہوں نے اس کے برعکس ایک وزیر کا اضافہ کردیا۔ اس سے قبل کابینہ میں وزراء کی متوقع کمی سے نئے وزراء تذبذب کی حالت میں تھے اور افواہوں کا بازار گرم تھا کہ فلاں وزیر گیا' فلاں کا پتہ کٹا۔ میں نے اس واقعہ پر یہ شعری کارٹون تحریر کیا ۔

شیخ صاحب کے اِشاروں کو سمجھنا چاہیئے
خواہ مخواہ چھوٹے وزیر اُن کے بیاں سے ڈر گئے
کر رہے تھے گرچہ وہ تخفیفِ کابینہ کی بات
کرتے کرتے اِک منسٹر کا اضافہ کر گئے

اُس روز دفتر پہنچتے ہی خواجہ صاحب نے مجھے بُلایا اور کہا کہ یہ قطعہ پسند کیا گیا ہے اور مجھے 'آفتاب' کے محبّ حاجی محمد جمال صاحب نے کہا ہے کہ تمہیں اِس کے لئے مُبارکباد دوں۔

کچھ وقت سے خواجہ صاحب' طاہر محی الدین کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے تھے جتنی کہ اُنہیں پہلے مِلا کرتی تھی۔ دفتر میں دیگر کارکن خصوصاً خوشنویس حضرات اِس بات کا برملا ذِکر کررہے تھے کہ طاہر صاحب پر خواجہ صاحب کی وہ پہلی والی نظرِ عنایت نہیں ہے۔ اِدھر یُوسف،

جمیل کے معاملے میں بھی شفقت و محبت میں کچھ کچھ کمی واقع ہو رہی تھی۔ تب میں نے سُنا کہ عنایات والتفات کا 'ابھی ہے اور ابھی نہیں' والا سلسلہ اِس قبل غلام نبی رتن پوری کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ رتن پوری کے رہتے ہی طاہر محی الدین ادارہ 'آفتاب' کے ساتھ وابستہ ہوئے تھے اور عنایات و توجہ کا مرکز دھیرے دھیرے طاہر محی الدین کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ یہی معاملہ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کے بارے میں رہا اور جب میں ادارہ 'آفتاب' میں داخل ہوا تب' جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، یوسف جمیل کا وہاں طوطی بولتا تھا۔ میرے ابتدائی ایام میں ہی ادارے میں بعض کرم فرماؤں نے مجھے خواجہ صاحب کے التفات کی ناپائیداری کے بارے میں بتایا تھا اور یوں بھی میری فطرت کے پیشِ نظر میں اُن کے پاس بلا ضرورت نہیں جاتا تھا۔ میں نے خود ہی ایک آڑ قائم کی تھی جس کی وجہ سے اُن کی شاباشیوں اور حوصلہ افزائیوں کا مجھ پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔

اک دن خواجہ صاحب نے مجھے بُلایا۔ جب میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اکیلے تھا۔ مجھ سے یو مخاطب ہوئے ''تم سارا دن یہاں کام کرتے ہو جبکہ اور لوگ بھی ہیں۔ تم باہر جا کر فنکشن وغیرہ cover کیا کرو۔'' اشارہ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کی طرف تھا۔ اس سے قبل وہ میری تنخواہ دوگنی کر کے چار سو ماہوار کر چکے تھے۔ اگر چہ مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا کہ میرے کام کا نوٹس لیا جا رہا ہے تاہم اس سے میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ مجھے پہلے ہی 'ناپائیداری التفات' کی گھنٹی سُنائی گئی تھی۔

۱۹۸۰ء کے ابتدائی مہینے تھے۔ ایک روز میں اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں رات کو ٹھہرا تھا۔ اُن دِنوں ہفتے میں ایک مرتبہ دُوردرشن سرینگر سے روگار بُلیٹین ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ اُس روز کے بُلیٹین میں انفارمیشن آفیسروں کی اسامیوں کے لئے درخواستیں دینے کی پہلے ہی نشر شدہ آخری تاریخ بڑھائے جانے کا اعلان کیا گیا۔ اِس سے پہلے میں نے اِس بارے میں نہیں سُنا تھا۔ چنانچہ اسامیوں کے لئے قابلیت کا جو معیار مقرر تھا میں اُس پر پورا اُترتا تھا۔ اگلے دن میں نے مقررہ فارم وصول کر کے درخواست دی۔ اِس کے بعد انٹرویو کے لئے بُلاوا آگیا۔ میں

نے نوکری کے لئے درخواست دینے کی بات طاہر محی الدین اور یوسف جمیل سے کی لیکن خواجہ صاحب سے اِس کا ذِکر نہیں کیا۔ دراصل مجھے اِس بات کا احساس کرایا گیا تھا کہ خواجہ صاحب مجھے نوکری کے لئے ادارہ سے جانے نہیں دیں گے اور اس کے لئے اگر ضرورت پڑی تو وہ انٹرویو پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اپنے برادر، جو ایک ماہ قبل ہی دہرہ دُون کے ڈاڈیا انسٹی چیوٹ آف ہمالین جیولوجی میں بطور سائنٹیسٹ مامور ہوئے تھے، سے ملنے کے بہانے کچھ دن کی چھٹی پر چلا گیا۔ اِس طرح کی رُخصت پر جانے کی ادارہ میں کوئی روایت نہیں تھی۔ بہر حال انٹرویو ۱۳ مارچ کو جموں میں ہونا تھا۔ میں اپنے بچپن کے دوست محمد شفیع، جن کی خود حال ہی بینک میں نوکری لگی تھی، کو ساتھ لیکر جموں چلا گیا جہاں میرا انٹرویو ہوا اور میں مطمئن ہو کر دِلّی سے ہوتا ہوا دہرہ دون چلا گیا۔ اس سے پہلے میں نے ریڈیو کشمیر میں ٹرانسمشن ایگزیکٹیو کی اسامی کے لئے بھی انٹرویو دیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ ابھی نہیں آیا تھا۔ بعد میں اِس اسامی پر بھی میری تقرری کا حکم آیا لیکن اِس سے قبل ہی میں محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گیا تھا۔ دہرہ دون سے واپسی پر میں نے 'آفتاب' میں اپنا کام دوبارہ شروع کیا۔

۱۶/اپریل ۱۹۸۰ء کی سہ پہر کو دفتر میں میرے لئے فون آ گیا۔ دوسری طرف جی ایم زاہد تھے جنہوں نے مجھے اطلاع دی کہ انفارمیشن افسر کے طور میری تقرری کا حکم جاری ہوا ہے اور میں آ کر نوکری جوائن کر لوں۔ اُنہوں نے اپنے ڈپٹی ڈائرکٹر مرحوم محمد امین پنڈت کو فون دیا جنہوں نے مجھے مبارکباد دی اور پُوچھا کہ کیا نوکری کا پروانہ لینے اُن کے دفتر آؤں یا کہ وہ یہ پروانہ میرے پاس بھیج دیں گے؟ پھر کہا کہ اگر میں اُدھر ہی آؤں تو ایک پیالی قہوہ میرے انتظار میں ہے۔ یہ انتہائی پُرخلوص اور مُشفقانہ دعوت تھی جسے رد کرنا نہ صرف دائرہ اخلاق کے باہر تھا بلکہ ایک سینئر افسر کا اپنے ہونے والے ماتحت ملازم کو اس طرح بُلانا اپنے آپ میں شرافت کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ میں یوسف جمیل اور طاہر محی الدین سے اِس خوشخبری کا تذکرہ کر کے محکمۂ اطلاعات کے لئے نکل پڑا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ خواجہ صاحب کو اِس کی اطلاع دیں۔ میں خود اِس طرح اچانک یہ بات اُنہیں نہیں کہہ پا رہا تھا۔ میں محکمۂ اطلاعات میں نوکری کا حکم

نامہ لینے گیا تھا لیکن وہاں مجھے جوائن کرنے کے لئے کہا گیا۔ میرے جوائننگ رپورٹ پر امین صاحب نے Welcome (خوش آمدید) لکھا۔ اِس کے بعد میں خواجہ صاحب اور 'آفتاب' میں اپنے رفقاء سے رسمی رُخصت لینے کے لئے واپس گیا۔ اِس دوران مجھے بتایا گیا کہ خواجہ صاحب ناراض ہیں۔ بہر حال! شام کو جب وہ صورہ میں اپنی رہائش گاہ کے لئے روانہ ہونے والے تھے، میں طاہر محی الدین کے ساتھ اُن کے کمرے میں گیا۔ یوسف جمیل پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ طاہر محی الدین نے اُن سے کہا" خالد صاحب کی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں نوکری لگ گئی ہے اور یہ رُخصت چاہتے ہیں"۔ خواجہ صاحب' جو گھر جانے کے لئے کھڑے ہوگئے تھے' نے ایک ترچھی نظر مجھ پر ڈالی 'کہا I am happy but I will not congratulate you" (میں خوش ہوں لیکن تمہیں مُبارکباد نہیں دوں گا)۔ الفاظ میں جو غُصّہ تھا وہ عیاں تھا۔ ایک اور بات جو اُنہوں نے کہی وہ یہ تھی کہ چونکہ تم حال ہی میں کئی دِنوں کی چھُٹی پر تھے اِس لئے اِس مہینے کے ۱۶ دنوں کی تنخواہ تمہیں نہیں دی جائے گی۔ تنخواہ کی بات کس نے کی تھی اور دِنوں کا کِس نے حساب رکھا تھا؟۔ اُلٹا مجھے ایسا لگا کہ میں نے جو خواجہ صاحب سے سرکاری ملازمت کا ذکر نہیں کیا تھا تو اُن کے فیصلے سے اِس خطا کا گویا کفّارہ ادا ہوگیا۔ اِس واقعہ سے پہلے جو حضرات وہاں سے رُخصت ہوئے وہ فارغ کئے گئے تھے۔ میں پہلا شخص تھا جو خود رُخصت ہورہا تھا۔ اِس بات کی تلخی رہی ہوگی۔ 'آفتاب' میں کام کرنے والے کُل وقتی صحافیوں میں سے، میں نے سب سے کم یعنی کوئی نو' دس مہینے ہی وہاں کام کیا۔ میرے ہم عصر طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کئی برس تک ٹِکے رہے۔ وہ مجھ سے بہت پہلے آئے تھے اور میرے بعد وہاں سے رُخصت ہوئے۔ بہر حال، میں خواجہ صاحب کا شُکریہ ادا کر کے نکل آیا۔ اپنی حسّاس طبیعت کے باعث میں نے پھر کبھی مُڑ کر اُس طرف نہیں دیکھا تاہم جب میں ۲۰۰۸ء میں ناظم اطلاعات بنا تو دو بار اُن سے ملنے گیا۔ ایک مرتبہ سرینگر میں اور دوسری مرتبہ جموں میں۔ وہ علیل تھے۔ اُن کے چہرے پر خفگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

خواجہ صاحب اور 'آفتاب' لازم وملزوم تھے۔ دراصل ایک کے بغیر دوسرے کا تصور

بھی ممکن نہیں تھا۔دونوں کشمیر کی صحافتی تاریخ کے اہم ترین باب کا عنوان ہیں۔اُن کے کنٹربیوشن سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔گزشتہ نصف صدی سے اخبار نے مقامی صحافت میں جو سنگِ میل طے کئے اُن سے ' آفتاب' کشمیر کی شناخت کے طور اُبھرا ہے۔یہ حقیقت اپنی جگہ ہے تاہم بعض پہلو ایسے بھی ہیں جس سے حساس قارئین کو ایک ذرا مایوسی ہوتی ہے۔مثلاً خواجہ صاحب نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے روزنامہ ' آفتاب' کو کشمیر کا ایک کثیرالاشاعت اُردو اخبار بنادیا مگر دستیاب وسائل کے حساب سے جو امکانات موجود تھے اُن کے باوجود افسوس ہوتا ہے کہ اخبار اہلِ دانش کی پسند نہیں بن سکا۔اس کی وجہ یہی ہے کہ ' آفتاب' اُس راہ پر گامزن رہا جس نے اسے واجبی طور پڑھے لکھے لوگوں کا اخبار بنا کے رکھدیا ہے۔جدید پرنٹنگ پریس، خبریں حاصل کرنے کے لئے جدید تر سہولیات، مناسب سرمایہ کی موجودگی ۔ایسے میں ' آفتاب' کے ایک مکمّل اور ہر طبقے میں مقبول اخبار بننے میں کیا دشواری تھی؟

کسی اخبار کا اپنی اشاعت کے مُسلسل پچاس سال پورے کرنا بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔اس کے لئے ادارہ ' آفتاب' مبارکباد کا مستحق ہے۔البتہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ اِس طرح کا مُستند اور بااعتبار ادارہ خود کو ایک محدود دائرے میں مقیّد کر کے اچھا نہیں لگتا۔ترسیلِ خبر کا کام یہاں اور بھی درجنوں اخبارات کرتے ہیں۔پچاس برس سے سرگرم ادارہ ' آفتاب' سے یہ توقع ہے کہ اِس کے زیرانتظام کم ازکم ایک ایسا علمی اور تحقیقی مرکز قائم ہو جہاں تشنگانِ علم کی پیاس بجھے اور تحقیق کے نئے سنگ ہائے میل بھی طے ہوں۔



☆...... عبدالرحمن مخلص

خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

تاریخِ ادبِ اُردو گواہ ہے کہ برِ صغیر ہند و پاک میں مولانا ظفر علی خان، اعجاز صدیقی، خوشتر گرامی، ادارہ ''شمع'' دہلی کے یوسف برادراں، رسالہ ''روبی'' کے رحمان صاحب وغیرہ جیسے صحافی اور مدیر پیدا ہوئے جنہوں نے عظیم شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کو اپنے جرائد کی مدد سے ایسا ابھارا کہ اُن کی دستارِ فضیلت آسمان کو چھونے لگی لیکن یہاں حال یہ ہے کہ اکثر جرائد ادیبوں شاعروں کو اُبھارتے نہیں بلکہ کم موقعہ دیتے ہیں۔ پانچوں اُنگلیاں چونکہ یکساں نہیں ہوتیں اس لئے ہمارے سرزمین کاشمر پر مرحوم خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب جیسے مدیر ''آفتاب'' لے کر اُبھرے اور اُن کونے کھدروں میں پڑے ہوئے ادیبوں شاعروں کو بھی نمایاں کیا جن تک آفتابِ عالم تاب کی روشنی بھی جنوبی افریقہ کے زبردست گھنے جنگلوں کی طرح پہنچتی ہی نہیں تھی۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن تاریخ ادب وصحافت میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور شاید لالہ وگُل کی طرح وقت وقت پر نمایاں ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

سب کہاں کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

شاید یہ بات حیرت انگیز ہے کہ میں نے اپنا پہلا اور آخری ناول میٹرک پاس کرنے کے

بعد ۱۹۶۰ء میں لکھا جسے شاہین بک سٹال سرینگر کے مالک مرحوم الحاج شیخ غلام محمد نے چھاپا۔ ۱۹۶۲ء اس کے بعد پہلا افسانہ ۱۹۶۳ء میں ہند چین جنگ کے پسِ منظر میں ''ایک خواب، ایک حقیقت'' کے نام سے روزنامہ ''خدمت'' سرینگر میں چھپا جس کے مدیر شری نندلال واتل تھے۔ اس کے بعد ''آفتاب'' سرینگر میں میرے افسانے، خاکے، انشائیے اور مضامین چھپتے رہے۔ ساٹھ کی اس دہائی میں میری نظر میں ادبی دُنیا کے صرف تین نام تھے: ''خدمت''، ''آفتاب'' اور ''شاہین بکسٹال''۔ ظاہر ہے کہ ''آفتاب'' کے مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب تھے اور اُس وقت ہر طرف ''آفتاب''، ''خواجہ صاحب'' اور اُن کے لاثانی کالم ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' کا طوطی بول رہا تھا۔ جس طرح آج تقریباً ہر شخص سرینگر ٹائمز کے مدیر بشیر احمد بشیر کے کارٹون کے بارے میں پوچھتا ہے کہ ''بھئی! آج کے سرینگر ٹائمز کا کارٹون دیکھا؟!'' اُسی طرح اُس زمانے میں تقریباً ہر اُردو داں پوچھتا کہ! بھئی! آج ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' پڑھا؟!'' وہ کالم تھا بھی غضب کا!! اُس کالم میں جہاں تیر و نشتر ہوتے تھے وہیں لاثانی اور آسانی سے زبان پر چڑھنے والی ترکیبیں ہوتی تھیں جو کشمیری ہونے کے باوجود اُردو جیسا رنگ و آہنگ رکھتی تھیں۔ مثلاً: قدمن مدد، عمرِ برکت، صحتِ بدن وغیرہ حق یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے اداریوں اور ''خضر سوچتا ہے ......'' میں وقت کے فراعین کی ایک طرح کی **Blood Surgery** کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے سورما کہلانے والے لوگوں کے پاؤں تلے سے زمین کھسک جاتی تھی جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ وہ الاماں والحفیظ اور سورۃ زلزال کا وظیفہ پڑھتے ہوئے کھلے آسمان کے نیچے آنے کی کوشش کرتے کہ کسی طرح جان بچالیں۔ ان کے قلم کا استحکام، قدموں کا ثبات اور ارادوں کی پختگی، قلم کی طاقت کو مجسم کردیتی تھی!! یوں تو بے باکی ایک چھوٹی سی ترکیب ہے لیکن اسے اپنے قول و فعل سے ثابت کرنا بڑے ہی دل گردے کا کام ہے اور وہ دِل گردہ خواجہ صاحب میں تھا اور اس کی شہادت اُن کی تحریریں آج بھی دے رہی ہیں جنہیں اہلِ نظر لوگوں نے آج بھی قندیلِ دل میں جلائے رکھا ہے۔

میں بدقسمتی سے زندگی بھر خواجہ صاحب سے روبرو نہ مِل سکا۔ ایک بار ملنے گیا تھا لیکن

وہ دفتر میں تشریف فرما نہیں تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب روزنامہ ''چٹان'' کے ایڈیٹر طاہر محی الدین ''آفتاب'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے اور پیر عبدالشکور صاحب مستقل لیکن مزے دار کالم ''سنڈے کے کوفتے'' لکھا کرتے تھے۔ ہاں ایک بار اُنہیں ٹورسٹ ریسپشن سینٹر کے مقابل وسیع وعریض گراونڈ میں ایک بڑے صحافی مجمعے سے خطاب کرتے دور سے سنا اور اُن کی زبردست طلاقتِ لسانی کا قائل ہوگیا۔ تحریر اللہ کا دیا ہوا ایک گُن ہے اور تقریر بھی۔ بہت ہی کم لوگوں میں یہ دونوں گُن بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر کہ خواجہ صاحب میری ہر تحریر کو اپنے خصوصی نوٹ یا توضیح (illustration) کے ساتھ شائع فرماتے تھے۔ ایک بار کسی پیارے لال صاحب بڈگامی کا مضمون ''آفتاب'' میں چھپا جس میں انہوں نے اساتذۂ کرام کے ساتھ روا رکھی زیادتیوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے اُس مضمون کے نیچے اپنے ایک نوٹ میں ریاست کے قلمکاروں کو دعوت دی تھی کہ جو چاہے، اس مضمون کا جواب لکھے! بڑے ہی مدیرانہ تدبر کے ساتھ اُنہوں نے قلم کاروں کے حوصلوں کو مہمیز کیا تھا۔ بہت سارے قلمکاروں نے جوابی مضامین لکھے اور میں نے بھی لکھا۔ خواجہ کو میرا مضمون پسند آگیا اور اسے بھی ایک نوٹ کے ساتھ شائع کیا کہ: ''اس مضمون کو بہت سارے مضامین میں سے منتخب کر کے چھاپا گیا ہے۔'' یہاں میرا مقصد خودستائی نہیں بلکہ یہ اعتراف کرنا ہے کہ اگر خواجہ صاحب نے میری حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی تو میں شاید اُبھر نہ سکا ہوتا بلکہ کہیں دھول مٹی میں مل کر گھل سڑ گیا ہوتا۔ اُنہیں دنوں ''آفتاب'' میں مرحوم عمر مجید صاحب اور ڈاکٹر بشیر احمد نحوی صاحب اکثر اپنے گہر پارے لکھتے رہتے تھے جنہوں نے بعد میں آسمانِ ادب کو چاند ستاروں سے بھر دیا اور اُردو زبان وادب کو مالا مال کر دیا خواجہ صاحب نے اپنا حصّہ ادا کر لیا۔ اب یہ ریاستِ جموں وکشمیر کے رسائل وجرائد کے مدیران محترم کا کام ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں کیونکہ باغِ اُردو کے تناور اور چھتنار درخت امتدادِ زمانہ کی وجہ سے سوکھتے گرتے جا رہے ہیں۔ اگر اُن کی جگہ نئے پودے نہ لگائے گئے اور محبت بھری آبیاری نہ کی گئی، تو باغ میں ریگستان کا سماں پیدا ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

یہ بات آج بھی اکثر لوگ مانتے ہیں کہ خواجہ صاحب مرحوم بہت ہی بڑے دل کے مالک, قلندر صفت آدمی تھے اور جو قلندر ہوتے ہیں، وہ اپنے پرائے اور دور ونزدیک کا تصور نہیں رکھتے۔ جن پر بھی اُن کی نظر پڑتی ہے، وہ اللہ کے کرم سے دمک اُٹھتے ہیں جیسے کسی پتھر کے ٹکرے نے پارس کو چھولیا ہو۔ حضرت اقبالؔ کے الفاظ میں ۔

درویشِ خدامست، شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفہاں، نہ سمرقند

جب خواجہ صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور کئی برس گزر گئے تو اس دوران میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے بقدرِ ظرف اُنہیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ میں چونکہ اُن کا احسان مند ہوں، اس لئے کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ وہ نوآموزوں کو فقط اُبھارنے چمکانے کا فن جانتے تھے۔ گرانے دبانے کی خو اور خصلت اُن میں تھی ہی نہیں۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اُن سیاست کاروں یا اُن کے متعلقین نے بھی اُنہیں گلہائے عقیدت نذر کئے جن کی کھال وہ ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' میں بڑی ہی فنکاری اور ہنر مندی سے اُتارتے رہتے تھے۔ اب ہماری یہاں کی سرزمین پر اُردو صحافت اور اُردو شعر و ادب سُرعت کے ساتھ رُو بہ زوال ہے۔ کچھ درد مند صحافی، ادیب، شاعر اِس زوال کی راہ میں قدغن لگانے کی فکر میں ہیں اور بڑی جدوجہد کر رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ اُنہیں ''عمرِ برکت''، ''صحتِ بدن''، اور ''قدمن مدد'' عطا فرمائے لیکن یہ بھی سوچتا ہوں کہ ۔

ہمالہ کے چشمے اُبلتے ہیں کب تک
خضرؔ سوچتا وُلر کے کنارے

............●●●............

☆...... طاہر محی الدین

خواجہ صاحب۔ کچھ یادیں، کچھ باتیں

۱۹۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کے بعد میں نے روزنامہ ' آفتاب' جوائن کیا اور یہیں سے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ دفتر میں میری کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ اخبار چار صفحات پر مشتمل تھا اور پہلے ہی تین سب ایڈیٹر موجود تھے۔ ان میں مسٹر غلام نبی رتن پوری قابلِ ذکر ہیں۔ دراصل میں نے زمانۂ طالب علمی میں ہی طے کیا تھا کہ صحافت کا پیشہ اختیار کروں گا اور مرحوم عبدالغنی لون کی وساطت سے روزنامہ آفتاب میں جگہ حاصل کی تھی۔ کام کا آغاز مراسلے تحریر کرنے سے کیا البتہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ بعد میں جب رتن پوری صاحب یہاں سے رخصت ہو گئے تو مجھے نیوز ایڈیٹر بنایا گیا۔ کچھ عرصہ بعد خواجہ صاحب نے آفتاب چیریٹیبل ٹرسٹ قائم کیا تو اپنے بجائے میرا نام پرنٹ لائن میں بطور ایڈیٹر درج کروایا۔ خواجہ صاحب پرنٹ لائن میں اپنا نام نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ میرے اصرار پر آپ آمادہ ہو گئے اور ان کا نام بطورِ چیف ایڈیٹر چھپنے لگا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں، اس میں "آفتاب" اور خواجہ صاحب کا خاص رول ہے۔ صحافت کی بنیادی تربیت اور سدھ بدھ یہیں سے ملی۔ ان دنوں یوسف جمیل (ممتاز صحافی) اور وادیٔ کشمیر کے منفرد شاعر خالد بشیر بھی وہاں کام کرتے تھے۔ خواجہ صاحب ایک سخت گیر اور ڈسپلن کے پابند استاد تھے۔ ہم سبھی کو دفتر میں وقت کی پابندی کرنا پڑتی تھی۔ خواجہ صاحب خود صبح ساڑھے نو سے دس بجے کے درمیان دفتر پہنچتے تھے اور شام کو 9 بجے واپس اپنی رہائش گاہ واقع

صورہ روانہ ہوتے تھے۔ میری ڈیوٹی صبح دس بجے سے رات دس بجے تک مقرر تھی۔ اس دوران پوچھے بغیر چھوڑنے یا غائب رہنے کی اجازت نہ تھی۔ میرے ذمّہ پروف ریڈنگ بھی تھی۔ لہٰذا اخبار کی کاپی تیار ہونے تک دفتر میں موجود رہنا پڑتا تھا۔ پروف کی غلطیوں پر آئے روز ڈانٹ پڑتی تھی۔ ماہانہ تنخواہ پہلے سو پھر ڈیڑھ سو روپے ملتی تھی۔ آفتاب میں انہی دنوں پی۔ ٹی۔ آئی اور یو ائن۔ آئی نیوز ایجنسیوں کے ٹیلی پرنٹر نصب ہوئے تھے۔ ہم دن بھر نیوز رول نکالتے اور خبریں بنا کر خواجہ صاحب کی میز پر رکھتے تھے۔ آپ ان کو ایک ایک کر کے اٹھاتے، ایک نظر ڈالتے اور کبھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے۔ بس چند آئٹم اپنے سامنے رکھ دیتے اور بعد میں ان پر سرخی لکھواتے۔ خواجہ صاحب خود بھی باقاعدگی سے کام کرتے تھے۔ ہاتھوں میں لرزش کی وجہ سے آپ خود لکھنے سے قاصر تھے۔ البتہ ہر روز اداریہ، ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' اور ''خبرِ زینہ کدل'' کالم بلاناغہ ڈکٹیٹ کرتے تھے۔ وہ دوسروں سے بھی اسی طرح کی پابندی سے کام کرنے کی توقع رکھتے تھے۔ حق بات یہ ہے کہ کبھی کبھی انہیں مطمئن کرنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ وہ دفتر میں کام کرنے والوں سے غیر مشروط تابعداری کے خواہاں تھے جو مجھ سے ہمیشہ ممکن نہیں ہو پاتا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ مجھ سمیت کئی لوگ آفتاب سے علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مجھے اقرار ہے کہ آفتاب میں تقریباً سات سال تک کام کرنے کی وجہ سے ہی میری زندگی میں نظم وضبط اور ڈسپلن پیدا ہوا۔ یہ عادت بعد میں ۱۹۸۵ء میں ہفت روزہ ''چٹان'' کی اشاعت شروع کرتے ہوئے میرے بہت کام آئی...... مرحوم صوفی غلام محمد (مدیرِ اعلیٰ سرینگر ٹائمنز) کا یہ مشورہ تھا ہفت روزہ چٹان کی بجائے ''روزنامہ چٹان' شروع کرنا چاہیئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہفت روزہ کی باقاعدہ اشاعت ایک کارے داردوالا معاملہ ہے۔ ان کی بات بالکل صحیح تھی۔ دراصل انہیں خود اس کا تجربہ تھا۔ انہوں نے سرینگر ٹائمنز کے ساتھ 'ہفت روزہ جاودان'' شروع کیا تھا جو زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ یہ صرف آفتاب سے ملے ڈسپلن کی وجہ سے ممکن ہوا کہ ہفت روزہ چٹان پورے ۲۷ برس تک باقاعدگی سے منظرِ عام پر آتا رہا۔

ڈیلی آفتاب میں سات سالہ قیام کے دوران خواجہ صاحب کے ساتھ مجھے گزرے دنوں

کے اتنے واقعات اور اتنی یادیں ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کیلئے پوری کتاب درکار ہے۔ یہاں چند ایک دلچسپ واقعات کا مختصر تذکرہ ممکن ہے۔

غالباً ۱۹۸۰ء کا زمانہ تھا کہ خواجہ صاحب ایک دِن اپنے معمول کے مطابق دفتر نہیں آئے۔ کوئی اطلاع بھی نہیں تھی۔ معلوم کرنے پر ان کے معتمدِ خاص منیجر عبدالسلام نے بتایا کہ ''آپ اخبار چلاتے رہو، خواجہ صاحب فی الحال نہیں آرہے ہیں''۔ اس کے بعد سلام صاحب نے اطلاع دی کہ خواجہ صاحب نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی ہے اور کہیں مراقبے میں بیٹھے ہیں۔ آئندہ اتوار کو میں ایک کاتب بشیر احمد (علمگری بازار) کے ساتھ ان کی تلاش میں نکلا۔ سلام صاحب نے کچھ اشارے دیئے تھے۔ بس کے ذریعے گاندربل گئے۔ وہاں سے مزید دو کلومیٹر پیدل چل کر دریائے سندھ کے کنارے واقع باغ میں پہنچے۔ خواجہ صاحب خام اینٹوں سے بنے ایک معمولی شیڈ میں قیام پذیر تھے۔ بھیڑ کی کھالوں کا فرش، ایک اسٹو اور چند برتن کل اثاثہ تھا۔ غالباً آپ خود ہی کھانا پکاتے تھے۔ ان کا یہ تجربہ لگ بھگ اڑھائی مہینے تک جاری رہا۔

ایک روز صبح دفتر پہنچتے ہی فرمایا کہ ''چلو! آج تمہارے گھر چلتے ہیں'' میرا گھر سرینگر سے تقریباً سو کلومیٹر کی دوری پر ضلع کپواڑہ میں تھا۔ اس زمانے میں موبائیل فون تو درکنار وہاں کوئی لینڈ لائن فون بھی نہیں تھا۔ میں نے بہت احتجاج کیا کہ پہلے مجھے گھر والوں کو مطلع کرنے دیجئے مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ مجھے گاڑی میں بٹھایا اور ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔ میرے گاؤں لیلم کپواڑہ میں رات گزارنے کے بعد ہم اگلے دِن واپس لوٹے۔ بٹہ مالو کے حمید اللہ خان، جو سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد دفتر آفتاب سے منسلک تھے، ہمراہ تھے۔

خواجہ صاحب بڑے خوددار آدمی تھے۔ کسی وزیر یا حاکم سے ملنے نہیں جاتے تھے۔ کئی سرکردہ سیاسی لیڈر آپ سے ملنے خود آفتاب کے دفتر آتے تھے۔ ۱۹۸۲ء میں، جب شیخ صاحب کا انتقال ہوا، ہم ساری رات دفتر میں رہے۔ شام کو شیخ صاحب کے انتقال کی افواہ سے شہر میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ لگ بھگ ۸ بجے شام فاروق عبداللہ نے ریڈیو پر آکر شیخ صاحب کی موت کی تصدیق کردی۔ اخبار کی کاپی تیار تھی مگر خواجہ صاحب اسے چھاپنے پر تیار نہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ اخبار

چھاپنے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ ان کا کہنا تھا کہ لوگ اخبار میں شیخ صاحب کی وفات کی خبر دیکھ کر مشتعل ہو جائیں گے۔ رات کے ڈیڑھ بجے آپ نے کہا کہ چلو شیخ صاحب کی رہائش گاہ تک گاڑی میں چکر لگاتے ہیں۔ راستے میں جگہ جگہ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ نیڈوز ہوٹل کے عقب میں واقع ان کی رہائش گاہ کے وسیع لان میں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ واپسی پر ہم نے اخبار کی کاپی پریس کو روانہ کر دی۔

خواجہ صاحب کی شخصیت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ آپ کو روپئے پیسے کی کمزوری نہ تھی۔ آپ کی ضروریات محدود تھیں۔ ان کے سر پر گھر گرہستی اور بیوی بچوں کا بوجھ نہ تھا۔ خود سادہ زندگی گزارتے تھے۔ درحقیقت آفتاب کا دفتر ان کی زندگی کا محور و مرکز تھا۔ اس سے باہر آپ کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

کشمیر میں اردو صحافت کے لئے خواجہ صاحب کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ ایک باقاعدہ، معیاری اور عوامی اخبار کی اشاعت کے علاوہ اخبار کی تقسیم کا باضابطہ نظام قائم کرنا، لوگوں کو اخبار بینی کی طرف راغب کرنا، آفسیٹ پرنٹنگ کا آغاز اور بعد میں اخبار کی رنگین اشاعت، ان سبھی چیزوں کا سہرا خواجہ صاحب کے ہی سر جاتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ خواجہ صاحب نے صحافت کے لئے جو کچھ کیا، آپ اس سے کہیں زیادہ کرنے کے اہل تھے۔



☆......جی آر صوفی

خواجہ صاحب ۔ ایک ممتاز صحافی

کشمیر میں صحافت کی تاریخ بہت زیادہ لمبی نہیں ہے پھر بھی اس کی جتنی بھی عمر رہی ہے۔اس میں صحافت کے منصۂ شہود پر کئی ممتاز صحافی ہی براجمان ہیں۔ان میں ریاست جموں و کشمیر کے مشہور عبقری ذہن، مفکر، مصنف اور سیاست دان سورگیہ پنڈت پریم ناتھ بزاز' مرحوم مولانا محمد سعید مسعودی ان کے بعد اگر ہم کہیں کہ مرحوم ثناءاللہ بٹ نے یہ کرسی صدارت سنبھالی تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔مرحوم خواجہ ثناءاللہ بٹ پچاس کی دہائی سے اپنے انتقال ۲۰۰۹ء تک ہماری ریاست میں اردو صحافت کے شاہ سوار رہے ہیں۔مرحوم کی کشمیر میں صحافتی زندگی کی ابتداء اس ماحول میں ہوئی جب خیالات کے اظہار کے لئے ماحول کوئی سازگار نہ تھا۔یہ دَور ذہنوں پر قفل اور لبوں پر مہرِ سکوت اور قوّتِ گویائی سلب کرنے کا تھا۔سکوت کی منجمد تہوں کو پگھلانے کا کام بہت حد تک مرحوم خواجہ صاحب کے کندھوں پر پڑا۔کچھ جذباتی اور انتہا پسند افراد تحفظات کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک آفتاب کی تمازت اتنی شدید نہ تھی لیکن گلیشر کی تہوں کو پگھلانے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ایک ہی شعلے سے گلیشر پگھل نہیں سکتا۔۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہی وادی میں عشقِ رسولؐ کے متوالوں نے ولولہ انگیز تحریک موئے مقدس کے درمیان سخت درو دیوار ڈھانے شروع کردیئے اور ذہنوں پر جو قفل لگے تھے ان کو توڑنے کا سلسلہ شروع کیا۔میری نسل سے تعلق رکھنے والے افراد نے اسی موسم میں ہوش سنبھالا۔اس عظیم عوامی تحریک کی مرحوم خواجہ صاحب نے آفتاب کے کالموں کے ذریعے جو آبیاری کی، وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔اس عوامی غم وغصے کا اظہار کرنے کیلئے آفتاب، خواجہ صاحب کی

قیادت میں سرفہرست رہا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی سے لے کر مرحوم بٹ صاحب نے انتھک محنت ومشقت سے آفتاب کو ریاست کے آفتابِ صحافت پر جس طرح چمکایا وہ انہی کا کمال تھا۔ کہتے ہیں کہ اس دور میں خواجہ صاحب کی دنیا صرف آفتاب تک ہی محدود ہوتی تھی۔ آفتاب کے صفحات کو سنوارنے کے لئے انہوں نے جدت اور تنوع سے اِسے ریاست کا نمبر ایک اخبار بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ صحافت کی ایک نئی طرز ڈالنے کیلئے انہوں نے اپنا مقصوص کالم 'خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'، لکھنے والوں کے (Free lancers) کے لئے باعث تحریر آنکہ کے کالموں سے اپنے قارئین کو آشنا کرایا۔ علم جرنل ازم کے مطابق ایک اچھے مدیر کی خصوصیت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی تحریروں میں تنوع، اختراع، موزوں اور صحیح الفاظ، اختصار (Brevity) اور تراکیب کے استعمال پر پوری قدرت حاصل کرے۔ اسی طرح ان اصولوں میں اصولِ readibility نمایاں ہونی چاہئے۔ خواجہ صاحب اپنی صحافتی زندگی میں ان معیاروں پر پورا اترتے تھے۔ آج بھی جب ہم ان کا مخصوص کالم 'خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے' پڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اگر چہ کالم بہت مختصر ہوتا تھا پھر بھی خواجہ صاحب عصری حالات پر ایسا بے لاگ تبصرہ کرتے تھے کہ پڑھنے والے عش عش کرتے تھے۔ اس کالم کی چاشنی کی مٹھاس اتنی تھی کہ قارئین آفتاب سب سے پہلے اسی کالم کو پڑھتے تھے۔ کبھی کبھار ان کی تنقید ایسی ہوتی تھی کہ ہدف بننے والا بسمل کی حالت میں تڑپتا تھا۔ ۱۹۷۰ء کا گرمیوں کا زمانہ تھا کہ میں علی گڑھ سے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کیلئے گھر آیا تھا۔ امر سنگھ کالج جہاں سے کہ میں نے۔ بی اے آنرس کرنے کا شرف حاصل کیا تھا کے میگزین ''لالہ رُخ''، جس کے اردو سیکشن کا اپنی طالب علمی میں ایڈیٹر تھا کے انچارج پروفیسر نے مجھ سے تقاضا کیا کہ لالہ رُخ ''اقبالؔ اور کشمیر'' کے موضوع پر نمبر نکالنا چاہتا ہے۔ مولانا مسعودی چونکہ لاہور میں کچھ عرصہ رہے تھے اس لئے استادِ محترم نے تقاضا کیا کہ مضمون لکھنے کے لئے مولانا مسعودی سے اقبالؔ کے بارے میں ان کے تاثرات لئے جائیں۔ مولانا صاحب کی قیام گاہ گاندربل پہنچا۔ مولانا نے دیانتداری سے یہ مانا کہ چونکہ وہ ان دنوں ایک سیاسی ورکر تھے اس

لئے علامہ اقبالؔ جیسی شخصیت کے ہاں رسائی ناممکنات میں تھی۔ پھر بھی مولانا نے مجھے اور میرے ساتھ کچھ اور طالب علموں کو اپنی مخصوص گفتگو سے مستفید کیا۔ اتفاقاً مجھے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے ہی خواجہ صاحب نے 'خضر میں' اپنے مخصوص انداز میں مولانا کی چٹکی لی تھی۔ اس وجہ سے وہ اس وقت کی لیڈر شپ پر گوشہ نشینی کی آڑ میں بے رحم انداز میں تنقید کرتے تھے حالانکہ مولانا بھی اُس لیڈر شپ کا ایک اہم حصّہ تھے۔ کیونکہ خواجہ صاحب نے جو بھی کچھ لکھا تھا وہ حقائق پر مبنی تھا مولانا نے اپنی ذمّہ داری سے انکار نہیں کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ انہوں نے کالم پڑھا ہے۔ خواجہ صاحب کو کہیئے کہ قوم اگر لیڈر شپ کو جواب دہ بنائے تو میں یعنی کہ مولانا اپنی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ خواجہ صاحب کے اس کالم کا موازنہ ان دنوں کے ایک اور ممتاز صحافی مرحوم شمیم صاحب کے ''آئینہ'' میں مشہور کالم 'چراغ بیگ' کے قلم سے' کیا جاسکتا ہے۔ ''خضر سوچتا ہے کہ ولر کے کنارے'' کی خوبی یہ ہے کہ یہ مختصر' برمحل اور قاری کے ذہن پر سیدھے اترنے والی تحریر ہوتی تھی۔ 'چراغ بیگ' کے قلم سے، کا کالم تفصیلی ہوتا تھا۔

جرنلزم کا ایک اور اصول یہ ہے ایڈیٹر کالم لکھتے وقت ادھر ادھر نہ دیکھے، فضولیات اور غیر متعلقہ باتوں سے اجتناب کرے اور اپنی بات کماحقہ' اپنے قارئین تک پہنچائے۔ قارئین کے وقت کا زیاں نہ ہو اور قارئین کی دلچسپی قائم و دائم رہے۔ چھوٹے چھوٹے الفاظ اور محاورات کا خوب استعمال ہونا چاہیئے۔ خواجہ صاحب اپنے اس مشہور اور شاندار کالم میں ان تمام لوازمات کا پابندی کے ساتھ انتظام کرتے تھے۔ کشمیری زبان وادب کے تناظر میں کچھ مخصوص محاوروں اور الفاظ کو استعمال کرنے کا ملکہ، خواجہ مرحوم کو تھا۔ اس سلسلے میں ''خبر زینہ کدل'' کا اچھا خاصا اور نہایت خوبی اور برمحل انداز سے استعمال کرتے تھے۔

مرحوم خواجہ صاحب کی بہ حیثیت مدیر آفتاب ایک ممتاز خدمت یہ رہی ہے کہ انہوں نے آفتاب کے صفحات خصوصاً باعثِ آنکہ اور صفحہ دو اور تین پر جو مضامین شائع ہوتے تھے، ان صفحات کو قلم کاروں کی ایک نئی پود کے لئے وقف کیا اور ان کو ہمت دلائی کہ وہ مختلف موضوعات پر لکھیں۔ اس طرح سے انہوں نے نوجوان قلم کاروں کو قارئین سے متعارف کیا۔ یہ لکھنے والے

مختلف شعبہ جات میں اب بھی سرگرم ہیں کچھ ان میں کامیاب صحافی بن گئے کچھ افسانہ نویس، شعراء اور ناول نگار۔ کچھ تو اس جہانِ فانی سے حال ہی میں رخصت ہوئے۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں یونیورسٹی ڈائری، سپورٹس کا کالم آفتاب کی زینت ہوا کرتے تھے۔ غرض کہ مرحوم بٹ صاحب نے کشمیر کی صحافتی، سیاسی اور معاشرتی دنیا میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام حاصل کیا جس کی صدائے بازگشت کشمیر کی آنے والی نسل بھی سنتی رہے گی۔ خواجہ مرحوم کے کچھ شاگرد عصری دور میں کچھ بیرونی اور مقامی انگریزی اور اُردو اخباروں کے رپورٹرز بن گئے اور اسی طرح عالمی شہرت رکھنے والی نیوز ایجنسیوں جیسے کہ بی بی سی، وائس آف امریکہ وغیرہ وغیرہ سے وابستہ ہوئے اور اپنے فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے نبھائے۔

مجھے یاد ہے کہ ''باعث تحریر آنکہ'' کالم کو تقریباً نئے لکھنے والے نوجوانوں کے لئے ہی وقف رکھا گیا تھا۔ ان نگارشات کو ایڈیٹ کرنا خواجہ صاحب کا اہم کام ہوتا تھا کیونکہ یہ نگارشات خام قلم سے نکلی ہوتی تھیں۔ صحافت کے طالبِ علموں کے لئے درس و تدریس کیلئے چند بنیادی اصول وضع ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا ہے کہ "Any fool can write. It needs a heavan born genious to edit" مرحوم خواجہ صاحب کا فن آفتاب کی سرخیوں کو موزونیت اور لکھنے والوں کی زبان کی نوک پلک سنوارنے کے اس معیار پر پورا اترتا تھا۔ خاص طور پر نوخیز لکھنے والوں کی تحریرات کو ایڈیٹ کرنے پر ملکہ حاصل تھا۔

خواجہ صاحب کی زندگی اور ان کی محفلیں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ ان کے کچھ ہم پیشہ، ہم عصروں پر یہ الزام لگتا ہے کہ وہ بغیر تحقیق کچھ سرکاری عہداروں کو ذاتی اغراض کے لئے ہراساں کرتے تھے لیکن میں نے کئی ان سرکاری ملازمین یا لوگوں سے بات کی ہے جن کے خلاف شکایتوں کی بنا پر مرحوم خواجہ صاحب لکھتے تھے۔ انہوں نے مرحوم پر ایسی کوئی انگلی نہیں اٹھائی ہے۔ ان کے ایک اہم ملازم نے جو آفتاب کے ساتھ تقریباً 12 سال تک منسلک رہے، مجھے ایک واقعہ بتایا کہ خواجہ صاحب مرحوم نے اس وقت کے ایک اہم عہدے پر تعینات آفیسر پر ایڈیٹوریل میں اطلاعات کی بنا پر زبردست حملے کئے لیکن جب یہ بات ان تک پہنچی اور تحقیق کے

بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ خواجہ صاحب نے غیر مصدقہ اطلاعات کی بنا پر آفیسر مذکورہ کے خلاف لکھا تھا تو متعلقہ وزیر جو کہ کچھ دنوں کے بعد ان کے دفتر میں گپ کرنے کے لئے آئے تھے۔ ان سے کہا کہ اس آفیسر کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ مرحوم خواجہ صاحب ایک لااُبالی شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ وہ Strong likings and dis-likings والی شخصیت تھی۔ زندگی کے آخری دنوں کے ان کی درویشی کے چرچے ان کے جاننے والوں تک پہنچے ہیں۔ آفتاب کو اپنی ذاتی منفعت اور اپنے عزیز و اقرباء کے لئے روزگار اور آمدنی کا ذریعہ نہیں بننے دیا بلکہ اس کو ایک ٹرسٹ میں تبدیل کیا۔ دورِ جدید کی حرص وہوس والی زندگی ان اصولوں سے نابلد ہے۔ ہم اب بھی خواجہ ثناء اللہ بٹ اور شمیم احمد شمیم مرحوم جیسے عظیم صحافیوں کی تلاش میں ہیں۔ اللہ کرے ہماری زندگی میں ہی اردو صحافت کو خواجہ مرحوم اور شمیم جیسی شخصیات پھر عطا ہوں۔



☆...... محمد نذیر فدا

تیر و نشتر

میں خواجہ ثناء اللہ بٹ مدیر ''روزنامہ آفتاب'' سرینگر کی بات کرتا ہوں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ریاست کے ایک بے باک صحافی تھے اور اپنی ساری زندگی ''آفتاب'' کو نکھارنے اور سنوارنے میں گزاری۔ میں نے ایک مختصر سا وقفہ دوردرشن سرینگر کے شعبہ خبر کے ساتھ گزارا لیکن اس دوران صرف دو یا تین بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ صحافت کے میدان میں ہمیشہ دوسروں سے الگ تھلگ رہے، وجہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر سودا نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے قلم کی تیکھی تحریروں سے ہمیشہ کباب میں ہڈی ثابت ہوئے اور اُسی بے رخی کی بنیاد پر انہوں نے اپنے پرائے دونوں سے اپنا لوہا منوایا۔ ع

خدا بخشے بہت سی خُوبیاں تھی مرنے والے میں

اخبار ''آفتاب'' سے میری شناسائی بچپن سے رہی۔ شاید سال ۱۹۶۰ء تھا جبکہ میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک مسجد تھی جس کا صحن محدود بہ دیوار نہ تھا۔ لوگ بازار تک جانے کے لئے مسجد کے صحن سے ہی راستہ چن لیتے۔ مسجد کی صحن میں ایک تالاب تھا۔ اس تالاب میں پانی صاف وشفاف موجود رہتا تھا۔ اندازہ کیجئے کی پانی کی تہہ میں سوئی یا چھوٹا کنکر بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک بار میں تالاب کی اور گیا تو دیکھا کہ تہہ میں اخبار ''آفتاب'' کا ایک پرچہ موجود ہے۔ میں نے فوراً اور تالاب میں ڈبکی لگائی تو ''آفتاب'' کا پرچہ اوپر لے کر آ گیا۔ میری خوشی کی حد نہ رہی، نہایت احتیاط کے ساتھ اس پرچے کو دھوپ میں رکھا۔ کچھ وقفہ کے بعد ''اخبار آفتاب'' کا یہ پرچہ سوکھ گیا۔ اس پرچے کو لے کر اپنے والد کے پاس گیا۔ وہ اخبار پڑھتا گیا اور خواجہ صاحب مرحوم کی بے باک تحریروں سے محظوظ ہوا۔ چوں کہ یہ زمانہ وہ تھا جب چھٹی جماعت کے بعد ہی طلباء کو انگریزی زبان سیکھنے کی سعی کی جاتی تھی۔ میں

نے بھی اس اخبار کو پڑھا...... لیکن آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ تیسری جماعت کا طالب علم یہ اخبار سکول لے کر گیا۔ اپنے ہم جماعتوں کو بھی نہایت ہی احتشام کے ساتھ دکھایا۔ اندازہ کیجئے جیسے میں نے کسی انمول خزانے کو پایا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شمبھو ناتھ ڈاکیہ کے ہاتھ سے حادثاتی طور پر پرچہ تیز ہوا کی وجہ سے تالاب برد ہوا تھا۔

خواجہ صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ سال ۱۹۵۶ء تک وہ کشمیر کے دوسرے حصے میں قیام پذیر تھے۔ اس دوران وہ وہاں خواجہ عبدالصمد وانی کے ساتھ راولپنڈی سے ہفت روزہ ''کشمیر'' کی ادارت میں شامل رہے۔ جب مرحوم غلام رسول سرفراز مظفرآباد سے واپس یہاں آئے تو وہ محکمۂ اطلاعات میں اسسٹنٹ انفارمیشن افسر مقرر ہو گئے۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ واپس سرینگر لوٹے لیکن وہ بیٹھنے والے ہرگز نہ تھے جبکہ انہوں نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ ''اخبار آفتاب'' لیتھو پر شائع کیا اور اس بات کو یقینی بنایا کہ اخبار کسی بھی طرح وادی کے اطراف واکناف میں چلا جائے۔ وہ روز سویرے اپنے دفتر آتے۔ ٹرانسپورٹ بھی اتنا وافر نہ تھا۔ اپنے سامنے اخبار ''آفتاب'' کی گھٹیاں بنا کر ان کو بس کے ذریعہ اسلام آباد، شوپیان۔ بارہمولہ، کپواڑہ اور سوپور لے جانے کا انتظام کرتے۔ خواجہ صاحب نے اپنے ہاکروں اور ملازموں کی حوصلہ افزائی کی تاکہ پرچہ لیتھو پر چھاپنے کے بعد سیدھے قارئین کے ہاتھ میں بغیر کسی تاخیر کے پہنچے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اگر اخبار وقت پر قاری حاصل نہ کرے تو وہ افادیت کھو دیتا ہے اور ردّی کا ایک حصہ بن کر بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی انتھک کوشش کی بدولت خواجہ صاحب نے سب سے پہلے سرینگر میں آفیسٹ پریس قائم کیا جو صحافت میں ان کی خدمت کا ایک غیر معمولی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ غالباً وادی میں اخبار ''آفتاب'' پہلا جریدہ ہے جو مختلف رنگوں میں پہلی بار چھپ کر منظر عام پر آ گیا۔

عرصہ دراز تک خواجہ بڈشاہ فلیٹس سرینگر میں نہایت سادگی کے ساتھ قیام پذیر ہے اور بعد ازاں صورہ کالونی میں اپنی رہائش گاہ تعمیر کی اور تادمِ مرگ وہیں بود و باش اختیار کی۔ وہ سادہ طرزِ زندگی کے دلدادہ تھے۔ کبھی نام و نمود یا نمائش پر فریفتہ نہ ہوئے۔ وہ حاکموں کی مدح سرائی

سے ہمیشہ احتراز کر گئے ورنہ صحافیوں نے کیا کچھ نہ کیا۔ اپنے اور اپنے افراد خانہ کو بے جا رعایت اور فائدے حاصل کرنے کے لئے صحافت جیسے پیشے کو داؤ پر لگایا۔ اکثر صحافیوں نے خواہ مخواہ تعریفوں کے پل باندھ کر خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صفحۂ قرطاس بے جا سیاہ کر دیئے اور اس عظیم اور مقدس پیشے کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ لیکن یہ نڈر اور بے باک صحافی ہمیشہ اپنی مدبرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی خودی اور ضمیر کو زندہ وجاوید رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

وادی میں اکثر روزنامے ''ایڈیٹوریل'' کے بغیر شائع ہوتے ہیں لیکن خواجہ ثناء اللہ بٹ نے کبھی ایسا نہ کیا۔ وہ تندرست وتنومند یا بیمار ہوں لیکن اخبار میں ایڈیٹوریل ضرور تحریر کر دیتے۔ وہ وقت کے بڑے ہی پابند تھے۔ وقت پر دفتر پر حاضر ہونا ان کا معمول تھا۔ وہ ''خضر سوچتا ولر کے کنارے'' ''خبر زینہ کدل'' یا ''جلیل جالکدوز'' جیسے کالم خود تحریر فرماتے تھے۔ ''خبر زینہ کدل'' کالم اصلی شہر کی روح زندہ وتابندہ رکھنے کا ایک اشارہ تھا۔ اور ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' میں ایسے نکات کی گرہ کشائی ہوتی تھی جس کو پڑھ کر قاری انگشتِ بدنداں رہ جاتا تھا۔ یہ عنوان بذات خود سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ جل شانہ، نے قرآن کریم میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا اور اسی قصہ کے نسبت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں اس واقعے کو ''حدیث الخضر مع موسیٰ'' کے ساتھ باندھا ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہ، نے دونوں یعنی خضر اور موسیٰؑ کے ملنے کی جگہ ''مجمع البحرین'' یعنی جہاں دو دریا یا دو سمندر ملتے ہوں۔ بتایا ہے لیکن خضر کو ولر کے ساتھ جوڑنا ایک اشارہ ہے سمندر کی طرف جہاں سے آپ ایک نئی بات، نئی فکر اور نئے احساس سے آشنا ہوں اور اس عنوان کے تحت خواجہ مرحوم اپنے دل کی نئی بات یا سوچ قارئین تک پہنچانے میں تازہ دم رہتے تھے۔ جہاں تک ''جلیل جالکدوز'' کالم کا تعلق ہے اس میں خواجہ صاحب اشارتاً ایسا کوئی مسئلہ اٹھاتے یا اس کی نشاندہی کرتے تھے جو یہاں کی صنعت وحرفت یا اقتصادی حالت سے براہ راست تعلق رکھتا تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ مرحوم نے ان کالموں کے ذریعے کسی کے لئے ہتک آمیز جملہ استعمال نہیں کیا جس سے کسی کی دلخراشی مقصود ہو۔

جب ڈاکٹر علاقہ بند صاحب نے ''سماج سدھار'' کمیٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی تو میں نے مرحوم ثناء اللہ بٹ سے اس کا تذکرہ کیا اور یہ رائے دی کہ ڈاکٹر صاحب کو پہلے اپنے ہی گھر سے اچھا کام شروع کرنے کی ابتدا کرنی چاہیئے ۔ میری تجویز تھی کہ کم ازکم دو مریضوں کا مفت معائینہ کرے اور جو بازار سے دوائیاں خریدنے کی سکت نہیں رکھتے، ان کی اعانت کی جائے ۔ میں نے ایک طویل خط ڈاکٹر صاحب کے نام لکھا جس کو خواجہ صاحب نے من وعن شائع کیا اور میری حوصلہ افزائی کی ۔ خواجہ صاحب غریبوں کا دکھ درد محسوس کرنے والے ایک حساس صحافی تھے ۔ انہوں نے آفتاب کی تمازت سے بہتوں کو یخ بستہ ہونے سے بچایا، وہ محنتی تھے اور ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے ۔

روز نامہ نکالنا کوئی آسان کام نہیں ۔ اس میں زبردست محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے ۔ پریس، نامہ نگار، ٹیلی فون سہولیتیں میسر ہونے کے بغیر اخبار کا چلنا محال ہے لیکن خواجہ صاحب نے ان مشکلات کے باوجود صحافت کی شمع کو جلائے رکھا ۔ آج کل اخبار جاری کرنا اتنا مشکل نہیں کیوں ذرائع اور روابط میں انقلاب آیا ہے ۔ دنیا ایک گاؤں کے مانند سمٹ گئی ہے ۔ پرنٹ میڈیا میں انقلاب انگیز تبدیلی بھی آچکی ہے لیکن خواجہ ثناء اللہ بٹ مرحوم لائق صد تحسین ہے جنہوں نے ان سہولیات کی عدم موجودگی میں بھی اپنے رشحاتِ قلم سے سبھوں کے دِل موہ لئے ۔ خواجہ صاحب اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑ گئے ۔ بلکہ اخبار'' آفتاب'' کی تمام جائیداد'' آفتاب چیرٹیبل ٹرسٹ'' میں عوام کے لئے وقف کردی اور صحافت کا یہ چمکتا آفتاب ۲۵ رنومبر ۲۰۰۹ء ہم سے رخصت ہوا ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن O



☆...... جاوید آذر

خواجہ صاحب سے ایک گفتگو

س۔روزنامہ ''آفتاب'' اپنی اشاعت کے پچاس سال پورے کرنے جارہا ہے۔کیا آپ اس موقع کے حوالے سے ''آفتاب'' کی شروعات کے بارے میں کچھ فرمائیں گے؟

ج۔''آفتاب'' ابتداء میں ہفت روزہ کی صورت میں جاری ہوا۔یہ ایام بہت ہی کٹھن اور مشکلات سے لبریز تھے۔مالی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ اخبارنویسی اور اخبار بینی کا ماحول بھی کچھ زیادہ موافق نہ تھا لیکن اللہ نے قدم قدم پر عنایت فرمائی۔

س۔بخشی غلام محمد کا دور تھا۔مشکلات اور مسائل تو رہے ہی ہوں گے!

ج۔جی ہاں! مشکلات اور مسائل تو بے شمار تھے لیکن بہ ایں ہمہ بخشی صاحب کی مجھ پر عنایت ہی رہی He was very kind to me

س۔ان سے تعلقات کیسے پیدا ہوگئے؟

ج۔ دراصل مظفرآباد سے وادی کی طرف پُش بیک کئے جانے سے پہلے میں راولپنڈی میں پانچ سال تک ''کشمیر'' نام سے ایک ہفت روزہ نکالا کرتا تھا، لہٰذا اُن غیر ملکی وفود جو مسئلہ کشمیر کے حوالے سے برِصغیر کے دورے پر آتے رہتے تھے، سے ملنا جلنا لگا رہتا تھا۔برطانیہ کے ایک پارلیمانی وفد سے مظفرآباد میں ملاقات ہوئی تھی۔انہی دِنوں وہاں کے اربابِ اقتدار نے مجھے گرفتار کرلیا۔یہ برطانوی وفد کچھ عرصہ بعد جب دلّی کے دورے پر آیا تو انہوں نے بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے میری گرفتاری کا ذکر کرکے میری خیر خیریت

دریافت کرنا چاہی چونکہ پنڈت جی کو کچھ معلوم نہیں تھا تو انہوں نے بخشی غلام محمد، جو اُن دنوں کشمیر کے وزیراعظم تھے اور دلّی میں مقیم تھے، سے استفسار کیا۔ بخشی صاحب نے سرینگر واپس آکر میرے بارے میں انکوائری کروائی اور مجھے اپنے پاس بلاکر ہمدردی کا اظہار کیا اور مجھے یقین دہانی کی کہ یہاں مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ بس یہی بخشی صاحب سے تعلقات کا سبب بن گیا۔

س۔ سُنا ہے بخشی صاحب نے آپ کو کچھ پیشکش بھی کی تھی؟

ج۔ جی ہاں! جب میں بخشی صاحب سے دوبارہ ملا تو انہوں نے مجھ سے میرے آئندہ ارادوں کے بارے میں دریافت کیا، تو میں نے اخبار نکالنے کی خواہش ظاہر کی۔ بخشی صاحب نے مجھے اس ارادے سے باز رکھنے کی کافی کوشش کی اور مثالیں دے دے کر سمجھایا کہ انہوں نے تین تین بار اخبار نکلوائے لیکن کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ بقول ان کے لوگ یہاں اخبار نہیں پڑھتے۔ بخشی صاحب نے مجھے چیف پبلسٹی آفیسر بنا کر پارلیمنٹ بھیجنے کی پیش کش کی چونکہ میں خود اس وقت مظلومیت اور کسمپرسی کی حالت میں تھا لہٰذا انکار یا اقرار کئے بغیر ہی چلا آیا۔ باہر مجھے بخشی صاحب کے سیکرٹری آر۔ سی۔ رینہ ملے۔ انہوں نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ سرکاری نوکری نہیں کروں گا، ہاں! اگر بخشی صاحب اخبار جاری کرنے کی اجازت دیں تو یہ ان کی مہربانی ہوگی۔

س۔ تو اس کے بعد آپ کو اخبار نکالنے کی اجازت ملی؟

ج۔ بخشی صاحب نے چند روز بعد مجھے دوبارہ بلوا کر نصیحت آموز انداز میں کہا کہ اب اگر آپ میڈیا کے ساتھ ہی رہنا چاہتے ہیں تو اخبار نکالنے کے بجائے ریڈیو کشمیر میں کام کریں یا روپے پیسے بنانے میں دلچسپی ہے تو میں BDO کے عہدے پر آپ کی تقرری کروں گا۔ اس پوسٹ پر اچھی خاصی کمائی ہوسکتی ہے۔ میں نے شکریہ کہتے ہوئے کہا کہ بخشی صاحب: یہ آپ کی شفقت ہے لیکن میں اخبار ہی نکالنا چاہتا ہوں۔ اس موقعہ پر بخشی صاحب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا، دیکھو: پار سے تو تم فساد برپا کر کے آئے ہو، کیا یہاں بھی کوئی فساد کھڑا کرنے کا ارادہ ہے؟ میں نے بخشی صاحب سے کہا کہ میں فسادی نہیں ہوں اور وہاں بھی میں نے کوئی فساد نہیں

البتہ یہ سچ ہے کہ میری حق گوئی اور سچائی سے کچھ لوگوں کو پریشانیاں لاحق ہوئی تھیں۔ بخشی صاحب نے کہا کہ میری طرف سے اجازت ہے لیکن مجھ سے امداد کی کوئی توقع نہیں رکھنا۔ چنانچہ بخشی صاحب نے ڈپٹی کمشنر سرینگر آغا ناصر علی، جو اس وقت باہر ہی بیٹھے تھے، کو بلا کر مجھے ڈیکلریشن جاری کرنے کی ہدایت دی۔ میں نے درخواست دی اور ویکلی ''آفتاب'' نکالنے کی اجازت مل گئی۔

س۔ اخبار کے اوّلین شمارے کے بارے میں کوئی اہم یاداشت؟

ج۔ جب پہلے شمارے کی کاپی تیار ہو کر مرکنٹائل پریس میں چھپنے کے لئے گئی تو پریس کے مالک نرنجن ناتھ نے آخری وقت پہ اخبار پرنٹ کرنے سے انکار کر دیا۔

س۔ وجہ؟

ج۔ پریس والے نے جب اخبار کے مندرجات کا مطالعہ کیا تو حکومت اور انتظامیہ کے بارے میں کئی تیکھی خبریں اور تبصرے دیکھ کر انہوں نے کہا کہ ''یہ اخبار نہیں بغاوت ہے''، میں تاجر ہوں، جھمیلے میں پڑنے کا روادار نہیں۔ ہم نے نرنجن ناتھ کی کافی منت سماجت کی لیکن وہ ایک نہ مانا۔ بالآخر میرے ایک دوست نے ان پر دھونس جمانے کی غرض سے کہا کہ انکار ٹھیک نہیں رہے گا کیونکہ خواجہ ثناء اللہ، بخشی صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ اس دھونس سے جب ان کے اعتراض کا پھاٹک بند ہونے لگا تو وہ کھڑکی سے آنے لگے۔ اب کی بار انہوں نے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ نیا نیا اخبار ہے، مالی حالت کا پتہ نہیں، پیسوں کی ضمانت کون دے گا؟ میرے دوست نے پیسوں کی ضمانت دی تو تب خدا خدا کر کے ہفت روزہ کا پہلا شمارہ مارکیٹ میں آ گیا۔

س۔ پہلے شمارے پہ کیا ردِ عمل ملا؟

ج۔ ردِ عمل کم و بیش حوصلہ افزا ہی تھا۔ میں پہلے شمارے کی اشاعت کے بعد بخشی صاحب کا شکریہ ادا کرنے گیا تو انہوں نے اندر بلا کر بلا تامل کہا ''تقسیمِ ہند کے بعد پہلی مرتبہ مجھے ایک حقیقی اُردو اخبار دیکھنے کو ملا ہے''۔

س۔ اسے روزنامہ بنانے کا خیال کیسے آیا؟

ج۔ کشمیر کا سیاسی ماحول بھی عجیب ہے۔ یہ چیزیں بننے کا سبب بھی بنتا ہے اور بگڑنے کا بھی۔ ریاست کی حکمران جماعت یعنی نیشنل کانفرنس پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ پارٹی کے چار اہم لیڈر خواجہ غلام محمد صادق، سید میر قاسم، ڈی پی دھر اور پنڈت ترلوچن دت بخشی سے فرنٹ ہوگئے اور انہوں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس (DNC) کے نام سے الگ پارٹی بنالی۔ ڈی این سی نے بخشی کے خلاف اپنی پالیسی اور پروگرام لوگوں تک پہنچانے کے لئے روزنامہ ''کشمیر'' جاری کیا۔ چونکہ وہ بھی اہم سیاسی شخص تھے اور دلی میں ان کا بھی اثر ورسوخ تھا لہٰذا بخشی صاحب انہیں اخبار نکالنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ ''کشمیر'' کو واحد روزنامہ بننے سے روک سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بلاکر روزنامہ ''آفتاب'' نکالنے کی تحریک دی۔ اگرچہ اخبار کی مالی حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن میں نے مالی وسائل کی تنگی کا رونا نہیں رویا البتہ انکار بھی نہ کرسکا۔ جب روزنامہ کے پہلے شمارے کی تیاریاں مکمل ہوئیں تو ڈائریکٹر انفارمیشن جانکی ناتھ زتشی میرے پاس آئے اور شمارے کی رسم رونمائی بخشی صاحب کے ہاتھوں کروانے کی صلاح دی۔ میں خاموش رہا۔ شاید وہ اسے میرا اقرار سمجھ بیٹھے تھے۔ گوکہ اس وقت حالات قطعی طور پر موافق نہ تھے، مالی اعتبار سے بھی پریشانیاں تھیں لیکن میں نے سوچا کہ اگر افتتاح بخشی صاحب کے ہاتھوں ہوا تو اخبار پہ سرکاری ٹھپہ لگ جائے گا۔ عوام میں اس کی کیا قدر و قیمت رہے گی؟ لہٰذا میں نے کسی کو خبر کئے بغیر چپکے سے روزنامہ ''آفتاب'' کا پہلا شمارہ مارکیٹ میں جاری کردیا۔ جانکی ناتھ زتشی پریشان ہوئے۔ انہوں نے فون پر اپنی پریشانی ظاہر کی تو میں نے انہیں ساری بات سمجھا دی۔ وہ سمجھدار آدمی تھے میری بات سے اتفاق کرلیا۔

س۔ ڈی این سی کے اخبار کے ساتھ آپ کی مقابلہ آرائی رہی؟

ج۔ ڈی این سی کے اخبار کی وجہ سے ہمارے لئے راستہ صاف ہوگیا۔ وہ بخشی کے خلاف تھے، ہم کسی کے خلاف نہ تھے۔ ہماری مخالفت اور حمایت کا معیار تو پیشہ وارانہ بنیادوں پر تھا۔ لہٰذا ہم عوام کی شکایات اور توقعات کو اچھی طرح زبان دینے میں کامیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ جو لوگ ''کشمیر'' پڑھتے تھے انہیں تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کے لئے

’’آفتاب‘‘ کا مطالعہ بھی ضروری کرنا پڑتا تھا۔اس طرح آفتاب کے قارئین کے حلقے میں اضافہ ہوا۔

س۔آپ بخشی صاحب کی شفقتوں کا اقرار کرتے ہیں لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ بخشی صاحب کے مقابلے میں شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کرتے تھے؟

ج۔جی ہاں! یہ بالکل صحیح ہے۔کیوں کہ شیخ صاحب کی بنیادیں عوام میں تھیں اور وہ عوامی لیڈر رہتے تھے،لہٰذا محاذ رائے شماری کے دور میں بلکہ ۱۹۷۵ء میں کشمیر ایکارڈ ہونے تک بھی میں کھلم کھلا شیخ محمد عبداللہ کی حمایت کرتا تھا لیکن ایکارڈ کے بعد ان کی ترجیحات میں تبدیلی آئی تو ہم نے بھی رابطے منقطع کر دیئے۔

س۔ایکارڈ کے بعد شیخ صاحب سے تعلقات کی نوعیت کیا رہی؟

ج۔دراصل شیخ صاحب کو مجھ پر بہت زیادہ بھروسہ تھا۔لہٰذا وہ اسی بھروسے کے ناطے ’’آفتاب‘‘ کو غیر اعلانیہ طور نیشنل کانفرنس کا آفیشل آرگن بنانا چاہتے تھے۔میں نے اس کا ذکر اپنی کتاب میں بھی کیا ہے جو شیخ صاحب کی زندگی میں ہی شائع ہوئی ہے۔لیکن جب اس سلسلے میں شیخ صاحب کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں تو انہوں نے مرحوم شمیم احمد شمیم کو ہفت روزہ ’’آئینہ‘‘ روزنامے میں بدلنے کا مشورہ دیا تاکہ نیشنل کانفرنس کی ترجمانی ہو سکے۔

س۔اس میدان میں آپ کو مشکلات کا بھی سامنا رہا ہوگا؟

ج۔آفتاب کی کہانی تو مشکلات کی ہی کہانی ہے۔ڈیکلریشن کے اجراء سے لے کر بخشی صاحب کی نیشنل کانفرنس تک، شیخ صاحب سے لے کر ۱۹۹۰ء میں عسکریت کے آغاز تک ہر مرحلے پر مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ رہا ہے۔عسکری تحریک کے آغاز میں تو آفتاب پر کئی مرتبہ پابندیاں بھی لگا دی گئیں جس سے کئی کئی دن تک اس کی اشاعت میں خلل پڑ گیا۔یہ دور تو صحافیوں اور صحافت کے لئے زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔بخشی صاحب کے زمانے کا ذکر کروں تو یہ مبالغہ نہیں ہے کہ وہ دور بھی نہایات سخت تھا۔

بخشی صاحب ذاتی طور اگرچہ میرے لئے نرم گوشہ رکھتے تھے لیکن ان کی پارٹی اور پارٹی کے جنرل سیکریٹری بخشی رشید تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔روزانہ طلبیاں ہوتی

تھیں اور وضاحتیں کرنا پڑتی تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں ہی جیل سے شیخ صاحب کی رہائی کی باتیں ہو رہی تھیں تو آفتاب نے سرورق پر بغیر کسی عنوان یا حوالہ سے عبدالاحد آزاد کی ایک کشمیری نظم کے یہ اشعار شائع کئے۔

سہہ گز یرِ زِ شال بیہہ ژۆل تل بیرے
پڑ شمشیر ے گیند نا ہ کر

(شیر جب دھاڑے گا تو گیدڑ منڈیر کے پیچھے چھپ جائے گا۔ شمشیرِ آبدار لے کر میدان میں آ!)

اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ لیکن موئے مقدس کا واقعہ، جس کے بارے میں یہ کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے پیچھے کن کا ہاتھ تھا، بخشی عہد کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ صادق صاحب وزیرِ اعلیٰ بنے تو انہوں نے لبرل پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے کشمیر میں تحریر و تقریر اور اظہارِ خیال کی آزادی کی بحالی کا وعدہ کیا۔

س۔ کیا یہ وعدہ ایفا ہوا!

ج۔ صادق صاحب واقعی ڈیموکریٹک تھے اور انہوں نے کافی حد تک تحریر و تقریر کی آزادی بحالی کی۔ ۱۹۶۷ء میں پنڈتوں کی ایجی ٹیشن کے موقعہ پر، جب پرمیشوری نامی ایک پنڈت لڑکی نے، پروین اختر کا نام اختیار کر کے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی تھی اور پنڈتوں نے زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا تو پنڈت ایکشن کمیٹی نے آفتاب کی حقائق پر مبنی رپورٹنگ سے خار کھا کر مرکزی وزارتِ داخلہ سے اخبار پر پابندی عاید کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت کے وزیر داخلہ وائی بی چوان نے صادق سرکار سے یہ پابندی لاگو کرنے کی زوردار سفارش بھی کی لیکن صادق صاحب نے اُن سے واشگاف الفاظ میں کہا کہ کسی ٹھوس الزام کی عدمِ موجودگی میں اخبار پر پابندی لگانا ممکن نہیں۔ نئی دلّی شیخ صاحب کو رہا کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی تو صادق صاحب نے اس میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کی بلکہ صادق کے دورِ حکومت میں ہی ۱۹۶۴ء میں رہائی کے وقت عوام نے شیخ صاحب کا ایسا استقبال کیا کہ کشمیر میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور یہ ایک

حقیقت ہے کہ صادق صاحب نے اس میں روڑے نہیں اٹکائے۔ آفتاب اس زمانے میں اس حد تک شیخ صاحب کی حمایت کرتا تھا کہ دلّی کے انگریزی اخبارات آفتاب کا حوالہ دیتے وقت ''عبداللہ نواز روز نامہ آفتاب'' (Pro Abdullah Daily Aftab) لکھتے تھے کچھ اخبارات تو ''رائے شماری نواز روزنامہ'' (Pro plebiscite daily news paper) لکھنے سے بھی نہیں کتراتے تھے۔ مگر صادق حکومت نے کبھی بھی اس حوالے سے آفتاب پر دباؤ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔

س۔ ایکارڈ کے بعد بھی شیخ صاحب کی حمایت جاری رکھی؟

ج۔ لوگ شیخ صاحب کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن ۱۹۷۵ء کے ایکارڈ کے بعد یہ صورتِ حال بدل گئی۔ ایکارڈ سے جو توقعات وابستہ ہوگئیں تھیں، وہ پوری نہیں ہوئیں۔ میں نے شیخ صاحب اوران کے ساتھیوں کو یہ پیغام پہنچایا کہ کم از کم وہ کوئی فیصلہ لینے سے قبل لوگوں سے پوچھنے کی روایت کا احترام کریں لیکن کون سنتا اور کس کی سنتا۔ بہر حال ۲/ مارچ کو جب شیخ صاحب جموں سے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے سرینگر آئے تو قاضی گنڈ سے لے کر لال چوک تک ان کا والہانہ استقبال ہوا اور لالچوک میں تقریباً ایک لاکھ لوگ ان کی تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ حالانکہ چند روز قبل ہی ۲۸ رفروری کو پاکستان کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے کشمیر ایکارڈ کے خلاف ہڑتال کی کال دی تھی اور اس کے جواب میں ایسا کشمیر بند ہوا تھا کہ کہیں پر کوئی متنفس نظر نہ آیا۔

س۔ اس تضاد کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج۔ یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے اور اسی وجہ سے ہم صدیوں سے تکالیف سہتے آئے ہیں۔ شاید یہ ہمارے سیاسی شعور کی ناپختگی کا ثبوت ہے۔ میں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں جو محمد شفیع اوڑی نے مجھے سنایا ہے کہ جب یکم مارچ ۱۹۷۵ء کو شیخ صاحب نے لال چوک میں اپنی تقریر کا آغاز کیا تو شیخ صاحب نے تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد علامہ اقبالؔ کے اشعار ترنم کے ساتھ سنائے، جب یہ شعر۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

سُنایا تو محمد شفیع اوڑی، جواُن دنوں عدالت میں وکالت کرتے تھے، نے جلسہ گاہ میں دوسرے وکیل سے کہا کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے تو دوسرے وکیل صاحب نے کہا کہ شعر جائے بھاڑ میں، آواز کی داد دو! تو جناب صورتِ حال یہی ہے! ہم آوازوں پر داد لُٹا رہے ہیں اور وقت نکلا جارہا ہے۔

س۔ آفتاب کی اشاعت کو پچاس سال گزر چکے ہیں۔ تب اور اب میں آپ کو کیا فرق محسوس ہو رہا ہے؟

بہت فرق ہے جب آفتاب شائع ہوا تھا اس وقت کشمیر سے تین روزنامے نکلتے تھے، تینوں کے ایڈیٹر کشمیری پنڈت تھے۔ روزنامہ ''خدمت'' کانگریس کا ترجمان تھا اور نندلال واتل کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ سناتن دھرم والے ''جیوتی'' شائع کرتے تھے جس کے ایڈیٹر رام چندرابھے تھے، جبکہ اخبار ''مارتنڈ'' کشمیر پنڈت کانفرنس کا ترجمان تھا۔ چونکہ یہ تینوں اخبار مختلف سیاسی اور مذہبی تنظیموں کے ترجمان تھے لہٰذا ان میں ان ہی جماعتوں کے نظریات اور ترجیحات کا دخل ہوتا تھا۔ عوامی اخبار کوئی نہیں تھا۔ آفتاب نے اکثریتی عوامی سوچ کی ترجمانی کر کے نئی شروعات کی۔ ان اخبارات میں صبح دس بجے سے شام چار بجے تک کام ہوتا تھا۔ یوں سمجھ لیجئے صحافت نہ تھی، سرکاری ملازمت تھی، لیکن آفتاب نے رات ۹ ربجے کا وقت ڈیڈ لائن مقرر کیا جس کے نتیجے میں لوگوں کے پاس تازہ خبریں آنے لگیں، اس سے آفتاب کی Relevence میں اضافہ ہوا۔ کشمیر میں ایک بہت ہی بڑا مفروضہ یہ تھا کہ مسلمان ایک کامیاب صحافی نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان سرکاری نوکریوں کے لئے بنے ہوئے ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ لوگ سرکاری ملازمتوں کے پیچھے دیوانے ہوئے جارہے تھے، نہ خبر کا کوئی علم تھا نہ اخبار کا۔ لہٰذا میرے لئے اس حوالے سے بھی بہت مشکلات تھیں لیکن میں نے ساری مشکلات کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آج صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ یہ مفروضہ بھی غلط ثابت ہوا ہے

کہ مسلمان صحافت کے میدان میں کام نہیں کر سکتے۔

س۔ کیا آپ کشمیر میں صحافت کے معیار سے مطمئن ہیں؟

ج۔ بہت حد تک۔ سب سے بڑا اطمینان یہ ہے کہ نوجوانوں نے صحافت کو سنجیدگی کے ساتھ اختیار کیا ہے، جس کے نتیجے میں کئی نوجوانوں نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا ہے۔

س۔ انتظامی سطح پر آفتاب کو کبھی کوئی مشکل مرحلہ درپیش رہا؟

ج۔ جی ہاں! جب اخبار آفیسٹ پریس پر شائع کرنے کا پروگرام بنا! آفتاب کے پاس آفسیٹ مشین خریدنے کے لئے مالی وسائل نہ تھے۔ دلّی میں روزنامہ ''پرتاپ'' والے اپنی مشین فروخت کر رہے تھے تو بہت ہی سخت مراحل سے گزر کر یہ مشین ہم نے خرید لی۔ لیکن افسوس یہاں کوئی مشین چلانے والا نہ ملا۔ مشین مین سے لے کر معمولی ٹیکنشن تک دلّی سے لانے پڑے۔ معمولی معمولی نقائص ٹھیک کروانے کے لئے خصوصی طور پر طیارے میں دلّی سے کاریگروں کو بلوانا پڑتا تھا۔ یہ بہت ہی پریشان کن دور تھا لیکن اللہ نے مہربانی کی اور مشکل وقت ٹل گیا۔

س۔ کیا کشمیر میں پریس کو آزادی حاصل ہے؟

ج۔ کشمیری عوام کا پریس کے اُوپر بہت یقین ہے اور یہ اسی یقین کی برکت ہے کہ کشمیر میں پریس زندہ ہے۔ جب تک یقین قائم رہے گا پریس زندہ رہے گا، اسے دبانے والے پیدا ہوتے رہیں گے لیکن وہ نہ رہیں گے جیسے ماضی میں پریس کو دبانے والے نہ رہے۔

(بشکریہ: کشمیر عظمیٰ جلد:۴، شمارہ نمبر:۳۰)



☆...... ناصر مرزا

صحافت کی دنیا کا درویش

روزنامہ آفتاب کے بانی مدیر مرحوم خواجہ ثناء اللہ بٹ (۱۹۲۲ء۔۲۰۰۹ء) دنیائے صحافت میں انمٹ نقوش چھوڑ کر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔نصف صدی پر محیط اپنے صحافتی کیریئر میں انہوں نے کئی معرکے سر کئے، کئی سنگِ ہائے میل طے کئے۔نہ صرف اخبار آفتاب کی صورت میں ایک ہر دل عزیز عوامی ترجمان پیچھے چھوڑ گئے بلکہ عصری تقاضوں سے آشنا اُردو صحافت کیلئے رہنما نقوش قائم کئے۔بلاشبہ انہوں نے کشمیر میں اردو صحافت کے نئے دَور کی بنیاد رکھی اور اس ناطے وہ بابائے صحافت کہلائے جانے کے حقدار ہیں۔

خواجہ صاحب ایک **لیجنڈ** (legend) تھے۔وہ انسانی حقوق کے علمبردار ایک عظیم کشمیری صحافی تھے جنہوں نے تمام عمر صحافت کے سنگلاخ میدان میں اپنی صلاحیتوں سے یادگار کردار ادا کیا۔ان کی قوتِ مشاہدہ گہری اور قوتِ فکر تیز تر تھی۔اس دور میں، جب وہ سرِ محفل تھے، انہوں نے اُردو صحافت کا ایک سنہرا باب رقم کیا۔

پہلی کرن

جولائی ۱۹۵۷ء میں اخبار ''آفتاب'' کا پہلا شمارہ، نیاز مانہ نئے صبح و شام پیدا کر، کا

دردمندانہ پیغام لئے اُفقِ کشمیر پر نمودار ہوا۔اسی پیغام کی صدائے بازگشت بعد کے شماروں میں سنی گئی جبکہ اسی جستجو میں 'آفتاب' ہر صبح طلوع ہوتا رہا۔اس کی پہلی کرن پڑتے ہی عوام وخواص اس کے گرویدہ ہوگئے۔''ایک چپ سوسُکھ'' کے اُس دور میں جب بات کرنی بہت مشکل تھی، انہوں نے عوامی احساسات کو زبان عطا کرنے والی صحافت شروع کرکے عوام کے دل جیت لئے۔انہوں نے اپنے مخصوص کالم،''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' میں مزاح کے ساتھ طنز کے گہرے نشتر سے عصری درد وکرب کی تصویر کشی کی۔اُفقِ کشمیر پر آفتاب ۵۳ برسوں تک ان کی زیرِ ادارت آب وتاب کے ساتھ چمکتا رہا اور اس طرح انہیں کشمیر کے ایسے پہلے صحافی ہونے کا اعزاز حاصل ہوا جنہوں نے ایک اخبار اجرا کیا اور اُسے شب وروز محنتِ شاقہ سے نصف صدی سے زائد عرصہ تک آندھیوں اور طوفانوں کے باوجود قائم ودائم رکھا۔خواجہ صاحب ایسے پہلے مدیر تھے جنہوں نے آفسیٹ پرنٹنگ اور رنگین طباعت سے اخبار کو مزین کیا۔نیز انہوں نے اخبار کی ترسیل میں ہاکروں کی خدمات اور ہوم ڈیلیوری سروس شروع کرنے میں اوّلیت حاصل کی۔ بحیثیتِ صحافی وہ کسی سے مرعوب نہ ہوئے جبکہ ان کا رعب اعلیٰ ایوانوں میں عیاں تھا۔کشمیریوں کی تین نسلیں ان کی فکر سے متاثر ہوئیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ آفتاب کا اجراء ایک انقلابی قدم تھا۔نیز یہ اس خلا کو پُر کرنے کا ایک برمحل اقدام بھی تھا جو پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ''ہمدرد'' کی اشاعت بند ہونے سے پیدا ہوا تھا۔اخبار آفتاب کو اجرا ہوتے وقت ہم عصر دنیا کس نظر سے دیکھتی تھی۔اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اخبار کی پہلی کاپی جب پریس مالک کو دکھائی گئی تو وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔اوّلین شمارے میں ہی بے باک تحریر دیکھ کر وہ ہکابکا رہ گیا۔''یہ تو بغاوت ہے''! وہ کہہ اٹھا۔ بہرحال آفتاب طلوع ہوا، انشاءاللہ کبھی نہ غروب ہونے کیلئے۔میرا خیال ہے کہ خواجہ صاحب کے اندازِ بیاں کی دلکشی، جذبات وخیالات کی روانی اور تحریر میں ایک Perspective مخصوص زاویہ نگاہ ہونے کی وجہ سے اخبار آفتاب کو کامیابی کے مدارج طے کرنے میں کافی مدد ملی۔درحقیقت سماج کی تشکیل اخبار سے ہوتی ہے اور اخبار کی تشکیل سماج سے ہوتی ہے۔

A newspaper informs and forms a community and a community informs and forms a newspaper. یہ بات اخبار آفتاب پر پوری طرح صادق آتی ہے۔اس نے کشمیریوں کو صحافتی دنیا میں ایک پہچان عطا کی جبکہ خود آفتاب کے عناصر ترکیبی میں ''کشمیر'' ایک اہم عنصر قرار پایا۔

مثالی مدیر

خواجہ صاحب خداداد صلاحیتوں سے لیس تھے۔اپنی ذات میں ایک انجمن، وہ بلاشبہ ایک ادارے سے بڑھ کر تھے۔آفتاب محض ایک اخبار کا ہی نام نہیں تھا بلکہ یہ میرے خیال میں وادیٔ گل پوش میں صحافت کی اوّلین درسگاہ تھی۔ جہاں سے اکتساب فیض کر کے کئی اصحاب فنِ صحافت سیکھ کر نکلے اور مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت پا گئے۔اُن سے فیضیاب ہونے والوں کی فہرست طویل ہے۔صحافت کے اس بہترین استاد سے استفادہ کرنے والوں میں نامور صحافی یوسف جمیل، ایڈیٹر 'گریٹر کشمیر' فیاض احمد کلو اور ظہور ہاشمی (موجودہ ایڈیٹر آفتاب) میں نمایاں نظر آتے ہیں۔خواجہ صاحب صحافیوں کے صحافی، مدیروں کے مدیر اور استادوں کے استاد تھے۔خواجہ صاحب میں ایک مثالی ایڈیٹر کی خوبیاں تھیں، وہ بہتر سے کمتر پر راضی نہیں ہوئے۔وہ صحافت کی اعلیٰ قدروں کے امین اور پاسبان بنے رہے۔کبھی ان سے ملاقات کا موقعہ ملا انہوں نے مجھے انتہائی شفقت سے نوازا۔ان کی مجالس میں علم و عرفان اور شعور و آگہی کے پھول مہکتے تھے۔خواجہ صاحب کی حِسِ ظرافت اپنی مثال آپ تھی جبکہ ان کا طنز لاجواب تھا۔ان کو ان خدمات کیلئے یاد رکھا جائے گا جو انہوں نے کشمیر میں صحافت کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنے کیلئے کیں۔ وہ کشمیر کاز کے ایک اہم وکیل تھے۔کشمیریوں کا عروج و ترقی ان کا مطمعِ نظر تھا۔وہ کشمیریوں کے جائز حقوق کے تحفظ کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔اصلاحِ معاشرہ ان کی آرزو تھی جبکہ کشمیر کو گہوارۂ امن دیکھنا ان کا خواب تھا۔مشکلات کے باوجود وہ 53 سال اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ہر سال کی ابتداء میں آفتاب کے اداریے میں اس عہد کی تجدید ہوتی تھی کہ اخبار عوام کے جائز مفادات کے تحفظ کی کوششوں کیلئے وقف رہے گا۔خواجہ صاحب نے اخبار کے لئے

ایک لحاظ سے اپنی ذات سے بھی دوری اختیار کی تھی۔ پروفیشن کے ساتھ اتنا لگاؤ شاذ ہی کہیں اور ملتا ہے۔ ذاتی آرام وآسائش کو تج کر وہ فقیرانہ زندگی گزارتے ہوئے ''آفتاب'' کو آب وتاب دیتے رہے۔ کشمیر پر ان کی دو گرانقدر تصانیف ''عہد نامۂ کشمیر'' اور ''کشمیر ۱۹۴۷ء۔۱۹۷۵ء'' کشمیری تاریخ کو سمجھنے کیلئے اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خواجہ صاحب قوم کاشمر کے ساتھ ہو رہی ناانصافیوں پر آواز اٹھاتے تھے، تو ساتھ ساتھ قوم کو اپنی غلطیوں کی اصلاح کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ وہ اکثر اقبالؔ کے الفاظ میں بتاتے تھے۔

؎ افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو

اور یہ کہ

؎ ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ عوامی اُبال کے مواقع پر ''گیت گایا پتھروں نے'' سے صورتحال کی عکاسی کرتے۔ نیز ''اور مارا گیا خلجی کا جانہ'' کہہ کر صورتحال کے دوسرے پہلو کو بھی اُجاگر کرتے۔ وہ اداروں کی کوتاہی، سسٹم کی ناکامی کے ساتھ ساتھ افراد کی کم کوشی پر بھی نالاں تھے اور اقبالؒ کے حکیمانہ اشعار کی روشنی میں معاملات کو سمجھنے کی فہمائش کرتے اور یہ سوال کرتے نظر آتے:

خدایا یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری

خواجہ صاحب ایک کشمیر دوست صحافی تھے۔ اخباران کیلئے صرف ایک کاروبار نہ تھا بلکہ سیاست، معیشت اور معاشرت میں بہتری اور اصلاحِ احوال کا ایک ممکن ذریعہ۔ ۱۹۵۳ء میں مظفر آباد سے جو اخبار انہوں نے جاری کیا اس کا نام ''کشمیر'' تھا جبکہ ۱۹۵۷ء کو حدِ متارکہ پار کر کے جب وادی لوٹ آئے تو اہلِ کشمیر کو ''آفتاب'' کا تحفہ دیا۔ وہ ایک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ہمدرد اور غمگسار انسان بھی تھے۔ دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ انہیں دُکھ میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے تھے۔ راقم الحروف کے کزن، سری نگر میں وائس آف امریکہ کے اس وقت کے نمائندے مرحوم قیصر مرزا دہلی میں ایک افسوس ناک سڑک حادثے میں جاں بحق ہوئے تو

خواجہ صاحب تمام مصروفیات چھوڑ کر کئی دن اہلِ خانہ کی ڈھارس بندھاتے رہے۔

درویش بادشاہ

خواجہ صاحب صحافت کی دنیا کے درویش بادشاہ تھے۔ اُنہیں صحافت کی خاطر ذاتی آرام وآسائش کی پرواہ نہ تھی۔ وہ صحافتی خدمات کے عوض مالی فوائد کے متلاشی نہیں تھے۔ مضامین کے بدلے زمین وجائیداد کے خواہش مند نہ تھے۔ خبروں اور تبصروں کے عوض بنکوں سے قرضوں کے سائل نہ تھے۔ نئے نوٹوں کی خوشبو اُنہیں ایمانداری سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ کھنکتے سکوں کی چھن چھن انہیں غفلت میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ انسان دوستی ان کا مشن تھا۔ ضمیر کی آواز پر کان دھرنا ان کا لائحہ عمل تھا، بے باکی ان کا شیوہ تھا۔ وہ ہمارے بُلبلِ ہزار داستان تھے، ہر روز نئے انداز میں نت نئے موضوعات کو زیرِ بحث لاتے تھے۔ وہ کشمیر دوست صحافت کے صفِ اوّل کے اولوالعزم قلمکار تھے۔

خواجہ صاحب کو جو عوامی مقبولیت نصیب ہوئی وہ بس ان ہی کا خاصہ ہے۔ ایسی پذیرائی معاصرین میں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہے۔ وہ ایک ایسے قلمکار تھے جن کی تحریریں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ان کا خصوصی کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' عوام وخواص میں یکساں طور مقبول تھا۔ گو ان کی آراء سے بعض اوقات اختلاف کی گنجائش بھی ہوا کرتی تھی، تاہم عام کشمیری اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ ان کے طنز ومزاح سے عام کشمیری کی افسردگی کو تبسم عطا ہوتا تھا اور اس کی پژمردگی، شگفتگی میں بدل جاتی تھی۔

خواجہ صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے کچھ اصحابِ دانش کے ہمراہ یہ ناچیز ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ گو وہ زیرِ علاج تھے تاہم ہشاش بشاش نظر آئے۔ دورانِ گفتگو، تشدد کی کسی واردات کا ذکر چھڑ گیا۔ خواجہ صاحب نے پُر خیال انداز میں کہا: ''تشدد اس مسلے کا حل نہیں!'' محفل پر سکوت طاری ہوا، کوئی کچھ نہ بولا، دراصل ان کی بارعب شخصیت کے سامنے مقرروں کی قوتِ گویائی جواب دیتی تھی۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جسارت کی، پوچھا: کیا عدم تشدد اس کا حل ہے؟'' جہاندیدہ مدیر مرحوم نے بلا توقف جواب دیا: ''عدم تشدد بھی اس کا حل نہیں!''

پھر وضاحت کی کہ مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے! وہ ایک فقرے میں سینکڑوں گتھیاں سلجھا دیتے تھے، ہزاروں اسرار بیان کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس طرح کہ مخاطب کے چودہ طبق روشن ہو جاتے تھے۔ طالبِ علمی کے زمانے میں راقم الحروف نے ایک بار ایک تحریر خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کی جس میں نوجوانوں کی ایک محفل کے حوالے سے درج تھا کہ کسی معاملے پر ''غور وخوض'' ہوا۔ انہوں نے وہ اوراق میز پر ٹپکتے ہوئے کہا ''غور وخوض''۔ الفاظ اس انداز سے ادا ہوئے کہ مخاطب کو نہ صرف غور وخوض کے لہجے سر نو معلوم ہوئے بلکہ ان لوازمات اور تقاضوں کی طرف بھی ذہن متوجہ ہوا جنہیں پورا کرنے کے بعد ہی ''غور وخوض'' کرنا ممکن بن سکتا ہے!!

حیرت انگیز امرِ واقعہ

اپنے ہم پیشہ معاصرین کے برعکس اور صحافتی روّیوں کے باوصف خواجہ صاحب بہت کم اپنے دفتر سے باہر نکلتے تھے۔ راقم الحروف کے والدِ نسبتی معروف صوفی بزرگ مرحوم پیرزادہ بدرالدین کے خواجہ صاحب کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ پیرزادہ صاحب خلوص خداترسی اور پارسائی کی بناء پر شہرِ خاص میں بنظرِ استحصان دیکھے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب وقتاً فوقتاً ان کے اصلاحی مضامین خاص اہتمام کے ساتھ آفتاب میں شاملِ اشاعت کرتے، نیز عیدین کے موقعوں پر خصوصی کالم میں ان کے نام بھی عید مبارک درج کرتے۔ پیرزادہ صاحب موصوف کہا کرتے تھے کہ ''خواجہ صاحب کی بہت سی آنکھیں اور بہت سے کان ہیں۔ گو وہ دفتر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں لیکن باہر کی دنیا کے بارے میں کسی اور سے زیادہ جانتے ہیں''۔ یہ ایک حیرت انگیز امر واقعہ تھا۔ اُنہیں دفتر میں رہتے ہوئے باہر کی دنیا کے بدلتے حالات کی نبض پر ہاتھ تھا۔ اقتدار کے گلیاروں میں سرخ قالین ان کی قدم بوسی کو ترستے تھے۔ دنیا ان کے دفتر کا طواف کرتی تھی، لیکن وہ اس سے بے نیاز اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے میں منہمک تھے۔ وہ ایسی ایک شخصیت تھے جن کے بارے میں حکیم الامتؒ نے فرمایا۔

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطان کی درگاہ

عبقری شخصیت

کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت میں ''آفتاب'' میں چھپی جامع خبریں زوردار سرخیاں، متوازن اداریے اور فکر انگیز مزاحیہ کالم زیر بحث آتے رہتے تھے۔ سال ۲۰۰۰ء میں راقم الحروف کو شوق ہوا کہ خواجہ صاحب کے شایان شان ایک سوانحی خاکہ شعبے سے شائع ہونیوالے جریدے ''میڈیا ٹائمز'' کی زینت بنے۔ خیال یہ تھا کہ اکابرینِ صحافت سے نئی نسل بشمول زیر تربیت صحافی آشنا ہوجائیں اور بالخصوص خواجہ صاحب کی قابلِ قدر اور لائقِ تحسین صحافتی خدمات سے حسبِ استطاعت متعارف ہوجائیں۔ چنانچہ ایک ہونہار طالب علم، ظفر اقبال، جواب این ڈی ٹی وی کے جموں میں مقیم نمائندے ہیں، کے سپرد یہ کام ہوا۔ میگزین کے چیف ایڈیٹر کے طور میں نے اس کا مسوّدہ دیکھا اور اس کا عنوان Pioneering Genius (صاحبِ اوّلیت نابغہ) تجویز کیا۔ رسالہ چھپ کے آگیا تو خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعی کی۔ کچھ جھجک آڑے آرہی تھی تاہم چھپنے کے بعد چھپنے کی صورت نہ تھی۔ چنانچہ ایک شام خواجہ صاحب کی خدمت میں رسالہ پیش ہوا۔ انہوں نے رسالہ ہاتھوں میں لیا، مضمون بغور پڑھا، اور پُر وقار خاموشی کے ساتھ ٹیبل پر رکھا۔ اس لمحے خواجہ صاحب کا سکوت ہمارے لئے حوصلہ افزا تھا اور باعثِ تسکین بھی کہ ایک عہد آفریں شخصیت نے ان کے متعلق ایک طالب علمانہ تحریر کو شرفِ قبولیت بخشا۔ لازم ہے کہ خواجہ صاحب کی حیات اور ان کے کارناموں پر تحقیق ہو ان کے صحافتی کردار کا مطالعہ کیا جائے، ان کی شگفتہ تحریروں کی بازیافت ہو، اور نئی نسل کو اس عبقری شخصیت سے متعارف کرانے کیلئے اقدامات کئے جائیں۔ اس ضمن میں برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال مبارکباد کی مستحق ہے کہ فی الوقت وہاں خواجہ صاحب کی صحافتی خدمات پر پی ایچ ڈی سطح کی ریسرچ کی جاری ہے اور ایک کشمیری اسکالر اس سلسلے میں محوِ عمل ہے۔

اُسے کہنا کہ لوٹ آنا

الغرض خواجہ صاحب اپنی تمام خوبیوں کی بنا پر یاد کئے جاتے رہیں گے۔ قومِ کاشمر انہیں سلامِ تحسین پیش کرتی رہے گی۔ اس دعا کے ساتھ کہ خواجہ صاحب کا ''آفتاب'' افقِ کشمیر پر

ہمیشہ چمکتا رہے۔مرحوم کی یادیں سپردِ قرطاس کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مدیر محترم کی جدائی کا درد کتنا بڑا ہے۔ فی الواقع اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔عرش صدیقی نے غالباً ایسا ہی درد سمیٹتے ہوئے کہا ہے ۔

اُسے کہنا دسمبر آ گیا ہے!
مگر جو خون جسموں میں سویا ہے
وہ پھر نہ جاگے گا
اُسے کہنا، ہوائیں سرد ہیں
اور زندگی کہرے کی دیواروں میں لرزاں ہے،
اُسے کہنا کہ گر سورج نہ نکلے گا
تو کیسے برف پگھلے گی؟
اُسے کہنا کہ لوٹ آنا!

اللہ کرے ''آفتاب'' روشنیاں بکھیرتا رہے اور اس صدقۂ جاریہ کے طفیل خواجہ صاحب مرحوم کے درجات بلند تر ہوں۔آمین

............●●●............

☆...... ظہور ہاشمی

مشفق اُستاد اور بے باک صحافی

کسی ملک کی تہذیب وتمدّن، رہن سہن اور اس ملک کے حالات وواقعات کی صحیح عکاسی میں قلمکاروں کا ہاتھ سب سے نمایاں رہتا ہے اور خاص طور پر جب قلمکار ایک صحافی ہو تو اس خطے کی صورت حال کے بارے میں بخوبی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔اس بارے میں کشمیری قوم خواجہ ثناء اللہ بٹ کی مرہونِ منت ہے جس نے اپنے قلم سے اس خطے کے عوام کے گونا گوں مسائل کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ان مسائل کے حل میں بھی ان کا نمایاں رول نظر آتا ہے۔خواجہ ثناء اللہ بٹ نے اس وقت صحافتی ذمہ داریاں سنبھالیں جب لوگ مقابلتاً کم پڑھے لکھے تھے۔ سائنس وٹیکنالوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، انٹرنیٹ کی سہولیات میسر تھیں نہ موبائل فون کا تصوّر ہی کسی کے ذہن میں تھا۔خبر رسانی کا واحد ذریعہ صرف ریڈیو تھا اور پچاس کی دہائی میں اخبار کی اشاعت متذکرہ بالا سہولیات کی عدمِ دستیابی کی وجہ سے ناقابل یقین لگتا ہے۔بہر حال انہوں نے اس میدان میں اپنے عزم وحوصلے سے قدم رکھا اور زندگی کے آخری ایام تک وہ اسی پیشے سے وابستہ رہے اور وہ بھی کامیابی کے ساتھ۔ جہاں تک خواجہ مرحوم کی شخصیت اور فن کا تعلق ہے اس بارے میں دورائیں نہیں ہوسکتیں کہ وہ گونا گوں صفات کے مالک تھے۔یہ ان کی شخصیت کے ساتھ ان کا فن ہی تھا جس نے انہیں صحافت کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بنادیا۔کسی خبر کی نوک پلک سنوار کر اسے اس حالت میں پیش کرنا کہ یہ خبر عوام کے دلوں میں نقش ہو جائے، خواجہ صاحب کا ہی طرہ ٔامتیاز رہا ہے۔اس وقت کشمیر یونیورسٹی کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں ماس کمیونکیشن کے نام سے شعبے قائم کئے گئے جہاں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو باضابطہ اس بارے میں تربیت دی جاتی ہے کہ خبریں کس طرح بنائی جاتی ہیں، کس خبر کی کیا اہمیت

ہوتی ہے۔خبر کہاں سے شروع کی جاتی ہے کہاں اسے ختم کرنا ہے۔اور اسے کس طرح اس قابل بنایا جائے کہ یہ لوگوں کے دل و دماغ میں عکس بن کر رہ جائے وغیرہ وغیرہ اور ایک سال مکمل ہونے کے علاوہ باضابطہ امتحان میں پاس ہونے کی صورت میں انہیں سند دی جاتی ہے لیکن خواجہ ثناء اللہ بٹ نے نہ کسی یونیورسٹی میں صحافت کے بارے میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی کسی نے انہیں سکھایا کہ صحافت کسے کہتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے صحافت ان کے رگ و ریشے میں رچی بسی تھی اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس پیشے کو زندگی بھر اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔اس کیلئے انہوں نے اپنی گھریلو زندگی کی بھی پرواہ نہیں کی اور اپنی پوری توجہ صحافت پر مرکوز کی اور یہی وجہ ہے کہ وہ کامیابی کی منزلیں طے کرتے گئے۔میں نے خواجہ صاحب کی شاگردی میں کم و بیش پچیس برس گزارے اور ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے ہی لوگوں کے اذہان میں اخبار خرید کر پڑھنے کا شعور پیدا کیا اور ایڈورٹائزنگ کا سلسلہ شروع کیا۔یہ سب کچھ اس وقت کیا گیا جب اخبارات میں اشتہارات چھاپنے کا تصور ہی لوگوں میں نہیں تھا۔ مرحوم خواجہ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ انہوں نے اس وقت اخبار کی اشاعت برقرار رکھی جب پیسوں کی کمی تھی اور اتنے ذرائع نہیں تھے اور اتنی سہولیات میسر نہیں تھیں جتنی آج ہیں۔اس کے باوجود دن رات کی کڑی محنت سے انہوں نے نہ صرف اخبار شایع کیا بلکہ اس کی اشاعت برقرار رکھی۔یہ کارے دارد والا معاملہ تھا۔خواجہ مرحوم کی شخصیت کے کئی پہلو تھے اور ہر پہلو سے ایک عظیم صحافی کی واضح تصویر سامنے آتی تھی۔گو خواجہ صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن صحافت کے علاوہ انہیں اقبالیات پر اس قدر عبور تھا کہ اقبالیات پر دسترس رکھنے کے دعویدار اُن کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے تھے۔اقبال کے اشعار کہنے کا انداز اور پھر ان اشعار کی تشریح وہ جس طرح کرتے تھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی بڑی یونیورسٹی کے پروفیسر کلاس میں لیکچر دے رہے ہیں۔خواجہ مرحوم کا تلفظ اس قدر صحیح تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن میں نے جو پچیس برس ان کی شاگردی اور قربت میں گزارے میں نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔

ان کی شخصیت بڑی رعب دار تھی اور جو کوئی ان سے ملنے آتا خواہ وہ وزیر ہو، امیر ہو، بیوروکریٹ ہو یا کوئی لیڈر یا سرمایہ دار سب کے سب ان کے سامنے خاموش رہنا ہی پسند کرتے تھے کیونکہ وہ ان پر اپنی چھاپ اس طرح بٹھاتے تھے کہ ان کیلئے ہونٹ کھولنا ناممکن بن جاتا تھا اور اگر کسی نے غلطی سے کبھی ہونٹ ہلائے تو ایسی بحث چھڑ جاتی تھی جو گھنٹوں جاری رہتی اور آخر کار خواجہ مرحوم ان پر ہر حالت میں حاوی رہتے تھے۔ اُن کے سیاسی نظریات سے اگرچہ اختلافات بھی ہو سکتے تھے لیکن جہاں تک صحافت کا تعلق ہے وہ اس فن میں یکتا تھے۔ زندگی کے آخری ایام تک وہ اکثر و بیشتر اخبار کی ''لیڈ'' شہ سرخی خود ہی لکھتے تھے لیکن اس سے قبل مجھے بلا کر کہتے تھے کہ میں لیڈ بنا کر لاؤں۔ میں اس دن کی اہم اہم خبروں پر مشتمل پانچ چھ سرخیاں لیکر ان کی ٹیبل پر رکھ کر چلا جاتا کچھ دیر بعد وہ مجھے دوبارہ بلاتے اور میں دیکھتا تھا کہ وہ سب کی سب شہ سرخیاں ڈسٹ بن کی زینت بنی ہوتی تھیں اور وہ مجھے ایسی سرخیاں لکھنے کو کہتے کہ میں بھی حیران رہ جاتا کہ ایسی شاندار شہ سرخی میں کیوں نہیں لکھ پایا۔ خواجہ صاحب اپنے ہاتھ سے نہیں لکھتے تھے بلکہ ڈکٹیشن دیتے تھے اور جب وہ مجھے ڈکٹیشن دیتے تھے۔ خواہ وہ ایڈیٹوریل ہو خبریں یا خضر سوچتا ہے...... الفاظ کی شیرازہ بندی اور جملوں کی سجاوٹ اور آسان لفظوں کا اس طرح استعمال کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ یہ ان کے اندر چھپے فن کار کا کرشمہ ہی تھا جس نے انہیں ایک اعلیٰ پایہ کا صحافی بنایا تھا۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی تحریر کی تھیں جن میں ''۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۷۱ء'' تک کے حالات و واقعات پر مبنی کتاب بھی شامل ہے۔ اس میں انہوں نے تحریک موئے مقدس اور اس وقت کے سیاسی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پھر ''عہدنامہ کشمیر'' میں ملی ٹینسی کے دَور کے حالات سے لوگوں کو آشنا کیا۔ ان کتابوں کو عوام نے سراہا اور یہ کتابیں ہاتھوں ہاتھ بِک گئیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ کسی بھی بڑی سے بڑی خبر کے مقابلے میں عوامی مسائل کو اجاگر کرنے کو ہی ترجیح دیں گے۔ ان کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ آج بھی آفتاب زیادہ تر عوامی مسائل کو حکام تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور ان مسائل کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے تا کہ انہیں حل کیا جا سکے۔ صحافت کی ساتھ ان کے وابستگی دیوانگی کی حد تک تھی

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے زندگی کے آخری ایام تک آٹھ دس سال آفتاب کے دفتر کے 8x10 کمرے میں ہی گزارے۔ان کے دن رات اسی کمرے میں گزرتے تھے جہاں انہیں دنیا بھر کے حالات وواقعات پر گہری نگاہ رہتی تھی۔خواجہ مرحوم کی یادداشت کی داد دیئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ان کی یادداشت اتنی تیز تھی کہ یقین ہی نہیں ہوتا تھا۔وہ سالِ ۱۹۳۱ء سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک کے اہم واقعات کے بارے میں بتاتے تھے کہ کوئی مخصوص واقعہ کس سال، کس تاریخ اور ہفتے کے کس دن واقعہ ہوا تھا۔انہوں نے اپنے پیشے کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا، ان کا قلم کبھی نہیں بکا اور وہ آخری ایام تک اپنے قلم کا حق سچائی اور ایمانداری سے ادا کرتے رہے۔وہ صحافت کے بے تاج بادشاہ تھے جنہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

خواجہ صاحب کے دوستوں میں کئی بڑے تاجر بھی شامل تھے اور ہر روز شام کو خواجہ صاحب سے ملنے آتے تھے اور رات دیر گئے تک مختلف موضوعات پر بحث چھڑتی تھی۔اس دوران خواجہ مرحوم انہی تاجروں کے بارے میں اکثر وبیشتر ان سے معلومات حاصل کرتے رہتے تھے اور انہیں مفید مشورے بھی دیتے تھے۔خواجہ صاحب کہتے تھے کہ کسی قوم کا تاجر پُر مغز ہو اور اپنے جائز مطالبات منوانے کی سکت رکھتا ہو تو اس قوم کی مالی حالت کبھی بھی پتلی نہیں ہوسکتی ہے اور اقتصادی طور ایسی قوم ہر طرح کے مصائب ومشکلات کا بخوبی مقابلہ کرسکتی ہے۔ہم سب آفس کے لوگ خواجہ صاحب کی اس منطق سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور میں اکثر وبیشتر ان سے کہا کرتا تھا کہ ہمیں تاجروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے لیکن وہ اس بات پر بضد تھے کہ تاجر قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں انہیں رہنمائی کی ضرورت ہے لیکن بعد میں وہی ہوا جس کا میں نے خدشہ ظاہر کیا وہ اس طرح کہ تاجر بکھر گئے ہر کوئی خود کو لیڈر سمجھنے لگا اور اس طرح ان میں اتفاق قائم نہیں ہوسکا۔خواجہ صاحب سیاسی حالات سے خوش نہیں تھے وہ سیاسی رہنماؤں کے مشترکہ پلیٹ فارم کے قیام کے خواہاں تھے یہ ان کا خواب تھا جو شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔



☆...... عمر مجید

خواجہ ثناء اللہ۔ تاریخی شعور کے نبض شناس

یہ سچ ہے کہ چہرے کی کتاب شخصیّت کی ترجمان ہوتی ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اسے پڑھا جاسکے۔ بعض چہرے خود بخود بولتے دکھائی دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے نقوش میں ان کی شخصیّت کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ایسا ہی گمبھیر، شائستہ اور دلنواز چہرہ خواجہ ثناء اللہ بٹ (جنھیں عرفِ عام میں خواجہ صاحب کے نام سے پکارا جاتا ہے) کا ہے۔ ملے جلے جذبوں کا حسین امتزاج، عاجزانہ مسکراہٹ، عارفانہ خاموشی، دوستانہ وقار، بزرگانہ شفقت، بے لوث اور اخلاص کا مکمل پیکر خواجہ صاحب وادیٔ گلپوش کا ایک ایسا نگینہ تھے جن کی چمک دمک آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہوگی۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں اپنا پہلا افسانہ لے کر آفتاب کے دفتر میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، آپ اس زمانے میں پینٹ اور پورے آستین کی قمیض پہنا کرتے تھے، آپ نے میرے سلام کا جواب نہایت خلوص کے ساتھ دیا تھا اور شاید عادت کے مطابق، مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔ بغیر کچھ پوچھے یا کہے میرا افسانہ لے لیا اور ایک ہی نشست میں پڑھا۔ میں خاموش بت بنا آپ کو دیکھتا رہا۔ "ٹھیک ہے!" بس آپ نے دو الفاظ کہے تھے اور کسی میں وحشت زدہ جانور کی طرح دفتر سے بھاگ نکلا تھا اور پھر تیسرے یا چوتھے روز میرا پہلا افسانہ "ایک بوڑھا ولر کے کنارے" آفتاب کے زرّیں اوراق کی زینت بنا تھا۔

کچھ دن کے بعد، میں آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا۔ آپ نے خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیتے ہوئے میری طرف بیرونِ ریاست میں چھپے اخبارات بڑھائے۔ میں خوشی اور حیرت

کے جذبات سے مغلوب ہوا۔ ان اخبارات نے آفتاب میں شائع شدہ میرا افسانہ Reproduce کیا تھا۔ ایک نئے لکھنے والے کے لئے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی تھی۔ اس کے بعد آپ کی شفقت اور محبت نے مجھے ایک نیا ولولہ بخشا اور میں جو کچھ بھی لکھتا تھا اُس کی نوک پلک سنوار کر آفتاب کی زینت بناتے تھے۔ احمد صاحب، مشہور آرٹسٹ، سے افسانے کی مناسبت سے تصویریں بنواتے۔ آفتاب اُن دنوں لیتھو پر چھپتا تھا لیکن نفاست اور خوبصورتی آپ کے حسن وسلوک اور ذوقِ جمال کے عین مطابق ہوتی۔ معیار آپ کی شرط اوّلین تھی اور آپ ہر قیمت پر آفتاب کے اعلیٰ معیار، حسن ونفاست اور صحت مند صحافت کے سزاوار تھے۔ آفتاب کا ایک ایک لفظ پریس میں جانے سے پہلے آپ کی نظر سے گزرتا تھا۔ لگ بھگ اسی زمانے یعنی ۱۹۶۵ء میں، آپ نے ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' لکھنا شروع کیا۔ اس کے شائع ہوتے ہی سیاسی، علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں تہلکہ سا مچا۔ یہ ایک قطعی نئی بات تھی۔ روزِ اوّل سے ہی سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے کمال سے حیرت انگیز طور پر واقف تھے۔ روانی، ربط وضبط، سادگی، مگر پُر اثر اندازِ بیان، جو بھی تیر آپ کے قلم سے نکلا سیدھا دِل کو جا لگتا۔

طنز وظرافت کا ادب میں ایک خاص مقام ہے اور اسے ہر زمانے میں عوامی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں کسی بھی موضوع کو اپنی اصل سے زیادہ کمتر بنا کر اس طرح سے مزاحیہ طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے منفی رجحانات پر توجہ مرکوز ہو۔ طنز کا خاص نشانہ فرد یا سماج کی برائیوں یا کمزوریوں اور کوتاہیوں کو مضحکہ خیز طور پر پیش کرنا ہوتا ہے لیکن اس میں ادبیت، تہذیب اور شائستگی کا التزام رکھنا پڑتا ہے۔ نہیں تو یہ سطحی اور تمسخر بن جاتا ہے۔ ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' طنز ومزاح کے تمام اوصاف پر پورا اترتا ہے۔

ایک نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

''مجھے تو اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا لیکن ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اپنے شہر کا ایک شیر گجری اور ایک نانبائی گزشتہ روز سرینگر سینٹر جیل کے داروغہ جیل کے پاس یہ درخواست لے کر گئے کہ انہیں جیل کاٹنے کی سرٹیفکیٹ

عطا کی جائے۔ یہ شیر گجری اور نانبائی چور بازاری اور ناجائز منافع خوری میں پکڑے گئے تھے۔ اور بعد میں اُنہیں ایک عدالت سے چھ، چھ ماہ کی سزائے قید دی گئی تھی۔ اِن دونوں کی درخواستیں پڑھ کر داروغہ جیل نے ان سے پوچھا کہ آخر اُن کا مقصد کیا ہے؟ تو انہوں نے اُسے بتایا کہ اُن کے محلے کا ایک شخص کسی زمانے میں کوئی اخلاقی جرم کرنے کی پاداش میں جیل گیا تھا، چونکہ وہ آپ سے چھ ماہ قید کاٹنے کی سرٹیفکیٹ حاصل کر کے مجاہد آزادی بن گیا ہے اور آج کل مبلغ ۲۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ پا رہا ہے۔ اسی لئے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی جیل کاٹنے کی سند حاصل کرلیں اور محفوظ رکھیں تاکہ آج کی طرح اگر مستقبل میں کبھی کوئی مجاہدین آزادی کی فہرست بنانا چاہئے تو اُس میں ہمیں بھی اس طرح چانس مل جائے جس طرح آج کل ہمارے جیسے بہت سے لوگ بھی بائی چانس مجاہدینِ آزادی بنے ہوئے ہیں اور ماہانہ تنخواہیں پا رہے ہیں اور داروغہ جیل اُن دونوں کا منہ دیکھتے رہ گیا۔ (بحوالہ آفتاب، ۱۶ رجولائی ۱۹۷۶ء)

مذکورہ بالا مختصر سے مضمون میں مصنف نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ آزادی اور جمہوریت کے نام پر ہمارے ہاں جو سیاسی ڈرامے کھیلے گئے اُن کے خاص کردار انگلی کاٹ کر شہیدوں میں شامل ہو گئے تھے اور گندے انڈوں کے شہزادے ہمارے مالک کُل بن گئے۔

ادبی دنیا میں طنز وظرافت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک مؤثر ذریعہ مانا جاتا ہے اور تہذیب وشعور کی علامت بھی۔ ایک طنز نگار ایک تیز حس نقاد ہوتا ہے۔ سلجھے ہوئے دل ودماغ کا مالک ہوتا ہے جو مسکراتے ہوئے ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو یا بالفاظِ دیگر قوم کی انفرادی یا اجتماعی خودغرضیوں کو بے نقاب کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک دیانتدار ترجمان بھی ہوتا ہے جو دو ٹوک بات کہنے کی مہارت اور حوصلہ رکھتا ہے اور آسان اور دلکش پیرایہ میں حقیقت کو آشکارا کرتا ہے۔ ظرافت سے طنز کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایک مزاح نگار جسے مولانا حالؔی نے بجائے حیوانِ

ناطق کے حیوان ظریف کہا ہے پہلے خود آمادہ تبسم ہوتا ہے اور پھر دوسروں کی کمزوریوں پر ہنسنے لگتا ہے۔ خواجہ ثنا نہ اللہ بٹ کی تحریر میں حسنِ بیان اور حاضر جوابی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ بات میں سے بات پیدا کرنا آپ کی زندہ جاوید تحریرات کی خصوصیات میں سے ہے۔

خواجہ صاحب گزشتہ چالیس برس سے برابر اور بلاناغہ "خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" لکھتے چلے آرہے ہیں۔ آپ اُردو زبان کے نئے دور کے اہم نقیب ہیں۔ آپ کا یہ کالم ایک ایسے فکری رویئے کا زوردار تسلسل ہے۔ ہر روز پیش کئے جانے والے ان مختصر مضامین میں اپنے عہد کا دل دھڑکتا ہے، آپ کے اسلوب میں طنز و ظرافت کا پہلو اُبھرتا ہے اس میں ظرافت کے مقابلے میں طنز کا پہلو زیادہ شدّت کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس کی بڑی اور خاص وجہ یہ ہے کہ آپ کا مقصد صرف دل بہلاوے کا ہی نہیں بلکہ آپ ایک بیمار قوم کو، جو مسّرت کے سرچشموں سے کوسوں دور ہے، ایک کڑوی لیکن حیاتِ بخش دوائی گڑ میں ملا کر پلانا چاہتے ہیں۔ آپ کے سامنے اپنی قوم کی نسل در نسل غلامی، معاشی بدحالی، طبقاتی کشمکش، بے چارگی، ضعیف الاعتقادی اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال اور دیگر ستم سامانیوں کا منظر نامہ ہے۔ جس کے خلاف آپ عوامی بیداری کے جذبۂ تب و تاب کو متحرک کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے غریب ہم وطنوں کو اپنے حقوق کا احساس دلانا چاہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر آپ حقائق کے چہرے سے کچھ اس طرح نقاب سرکاتے ہیں کہ قاری مسکراہٹوں کے ساتھ دل ہی دل میں، اندر ہی اندر، روح کے کسی گوشے میں، دل کے کسی نہاں خانے میں آنسو بہانے لگتا ہے لیکن آپ کا انداز کھرا اور دوٹوک ہے۔ آپ کی تحریر صرف واہ نہیں آہ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ہر روز بلاناغہ طنز کے تیروں سے سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی زہرناکیوں، تشنگیوں، تلخیوں بے ضابطگیوں کے سینوں کو چھلنی کرتے ہیں، جو بڑے دل گردے کی بات ہے۔

تاریخ نویسی ایک مقدس فن ہے۔ تاریخ حقیقت میں انسانیت کا محافظ ہے جو نہ صرف قوموں اور جماعتوں بلکہ کُل بنی نوع انسان کے پچھلے تجربات کا دفتر محفوظ رکھ کر انسان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو تاریخ کے بغیر انسان ایک بے شناخت آدم زاد ہے۔ کشمیر میں تقسیم سے پہلے بالعموم اور اس کے بعد بالخصوص تاریخ جیسی مقدس امانت کی جس بے دردی اور بے شرمی سے

''قوم پرستی'' اور وطن دوستی کے نام پر اہانت وتذلیل کی گئی اس کا خواجہ ثناء اللہ بٹ کو شدید احساس ہے اور نہایت قلق ہے۔ شاید اسی احساس اور قلق نے آپ جیسے منفرد اور ذمہ دار صحافی کو ایک سچا صادق القول، حاذق التحریر مؤرخ بنادیا۔ آپ نے تاریخ نویسی تو اپنی فطری طبع اور ذاتی ذوق و رجحان سے مغلوب ہو کر اپنائی مگر کمال صدق وعدل کے ساتھ، عبادت سمجھ کر اور دامنِ امانت کو کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔

چنانچہ آپ نے سب سے پہلے ''کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک'' قلم بند کی جو ۱۹۸۰ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی۔ یہ تاریخ ریاستِ جموں وکشمیر کی تیس سالہ پرآشوب دور کی آئینہ دار ہے۔

خواجہ صاحب نے تاریخ دانی کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کشمیر کی ایک ایسی تاریخ لکھنے کا کام شروع کیا، جو سائنٹفک اصولوں پر لکھی گئی ہو اس تاریخ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر لایا جس کا عنوان ''عہد نامہ کشمیر ہے''۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ صرف تین ماہ کے اندر اس کا دوسرا ایڈیشن بھی منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبالؒ کو اپنے وطن کشمیر کے ساتھ جو والہانہ محبت تھی اتنی ہی والہانہ محبت خواجہ صاحب کو علامہ اقبالؒ کے ساتھ ہے۔ علامہ کو اپنے کشمیر النسل ہونے پر بڑا ناز تھا اور اسی فخر وناز کے ساتھ انہوں نے خود کو ''تنم گلے زخیابانِ جنت کشمیر'' کہہ کر اپنا تعارف کروایا اور خواجہ صاحب نے ''آفتاب'' کے لئے اسی مصرع کو دستور العمل بنادیا۔ جس کی پاسبانی اور آبیاری اپنے خونِ جگر سے پچھلے پچاس برس سے کرتے چلے آرہے تھے۔

ریاستِ جموں وکشمیر کی صحافتی تاریخ میں ''آفتاب'' نے جو تاریخ ساز رول ادا کیا ہے اُس پر ریاست کے عوام بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں اور فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کی اردو صحافت میں کشمیر پیچھے نہیں رہا۔ ابتدائی ایام (جون ۱۹۵۷ء جب ہفتہ وار (آفتاب) کا آغاز کوکر بازار سرینگر کے ایک مکان میں ہوا، نے جلد ہی روزنامے کی شکل اختیار کی) آفتاب کے لئے نہایت حوصلہ شکن تھے۔ وادی میں اس وقت صحافتی مزاج ناپید تھا اور شاید ہی کوئی عام آدمی اخبار خریدنے اور پڑھنے

میں دلچسپی رکھتا تھا لیکن انتہائی نامساعد حالات اور ناداری کے عالم میں خواجہ صاحب نے اخبار جاری رکھنے کا عزم برقرار رکھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد یہاں سیاسی اور مجلسی آزادی کے ساتھ ساتھ صحافت بھی دم توڑ چکی تھی۔ عوام مقامی اخبارات کی اہمیت سے تقریباً بیگانہ ہو چکے تھے لیکن ''آفتاب'' نے عوام میں صحافتی مزاج قائم کرنے میں نہایت اہم رول ادا کیا اور جب آفتاب نے ہاکروں کے ذریعے اخبار فروخت کرنے کی روایت قائم کی تو اُس وقت کے صحافتی حلقے نے اُس کا مذاق اُڑایا کیونکہ ''آفتاب'' پہلا اخبار تھا جو سکندر نیوز ایجنسی کی دکان پر صبح سویرے نظر آتا تھا۔ مقامی تجارت اور دوسری اشیاء بنانے والوں کے اشتہارات حاصل کر کے اخبار میں شائع کرنے کی روایت بھی اس اخبار نے قائم کی۔ آفتاب عوام تک پہنچانے کے لئے شہر کے ہر حصے اور قصبہ جات میں نیوز پیپر ایجنٹ بنانے کی روایت بھی ''آفتاب'' نے جاری کی تا کہ لوگ صبح سویرے کام پر نکلنے سے پہلے اپنے نزدیکی ایجنٹ سے اخبار حاصل کر کے اخبار بینی کے عادی بن جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں نئے شائع ہونے والے اخبارات نے بھی اس سہولیات سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے لئے آفتاب نے بڑی لگن اور محنت کے بعد بازار تیار کیا تھا۔ نئے اخبارات کو کسی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کشمیر میں جدید ترین چھپائی کی مشینری لانے کا سہرا بھی آفتاب کے سر ہے اور آفتاب ریاستِ جموں و کشمیر کا پہلا اخبار ہے جو ۱۹۷۱ء میں فوٹو آفسیٹ پر چھپنا شروع ہوا۔ اس کے چند سال بعد خواجہ صاحب نے آفتاب کو مزید خوشنما اور دیدہ زیب بنانے کے لئے اِسے خوبصورت رنگوں سے سجایا۔

خاکسار اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ خواجہ صاحب اس اخبار اور اس کے تمام تر اثاثے کو قوم کے نام وقف کر چکے تھے۔ ان کا اپنا کوئی بھی مالی مفاد اس کے ساتھ وابستہ نہیں اور وہ ایک چاق و چوبند نوجوان کی طرح اٹھارہ گھنٹے عوام کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ اخبار کو سجانے سنوارنے میں، اداریہ، خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے، مضامین، خبریں یہاں تک کہ ایڈیٹر کی ڈاک کے ایک ایک لفظ کی ایڈیٹنگ کرتے تھے۔ آپ شروع سے ہی کشمیر کے ایک سچے پرستار اور محبت کرنے والے دوست کی طرح اپنی قوم کو عزت و آبرو کی زندگی گزارنے کے علمبردار تھے۔

خواجہ صاحب نہ صرف خود ایک جیّد عالم، منفرد قلمکار، بے مثال طنز نگار اور قابلِ فخر صحافی تھے بلکہ ادب نواز بھی ہیں اور نئے لکھنے والوں کی بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ گلستانِ ادب کے واحد باغبان ہیں جو ننھی ننھی کلیوں کی نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ آبیاری کرتے تھے۔ اُن کی آبیاری میں نہ جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں نے جنم لیا اور علم و ادب کے تناور پیڑوں کی صورت اختیار کرلی۔ وہ بازارِ ادبیات کے واحد جوہری ہیں جو ناتراشیدہ ہیروں کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہیں ان کی تراش خراش کرتے ہیں اور ادبی دنیا کے بازار میں سجاتے تھے۔

۱۹۹۰ء میں حکومتِ وقت نے آفتاب پر پابندی عائد کی اسی سال مدینہ چوک گاؤ کدل میں آفتاب کے فوٹو آفسٹ پریس کو نذرِ آتش کیا گیا۔ لوہے کی مشینوں کے ساتھ تاریخ کے اوراق بھی پگھل گئے۔ آفتاب کی چالیس سالہ فائلیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ مشین دوبارہ لگ گئی آسان کام تھا......لیکن تاریخ؟

اپنے بھی خفا مجھ سے، بیگانے بھی ناخوش

کسی دل جلے ادیب کا قول ہے کہ بگڑا ہوا ادیب صحافی بن جاتا ہے۔ ادیب پتھر کے پھول مارتا ہے اور صحافی [illegible] عاسر پر پتھر مارتا ہے۔ لیکن خواجہ ثناء اللہ بٹ ایسے صحافی تھے جو ادیبوں کی بھی خوب خبر لیتے تھے۔

جن حضرات نے خواجہ صاحب کو آمنے سامنے نہیں دیکھا ہے وہ شاید سمجھتے ہوں گے کہ وہ نہایت اکھڑ، رعب دار اور غصہ ور ہوں گے مگر وہ نہایت شگفتہ مزاج اور خوش طبع ہیں۔ خصوصاً اپنے ہم صحبت یاروں میں بڑی ظرافت اور طنز کے پھول برساتے تھے۔

(بشکریہ: کشمیر عظمیٰ جلد:۴، شمارہ نمبر:۳۰)

...........●●●...........

☆...... ظریف احمد ظریف

خواجہ ثناء اللہ بٹ۔ یادوں کے دریچوں سے

سرِ زمین کشمیر نے بڑے بڑے عالموں، شعراء، ادباء، صوفیاء، موّرخوں اور عظیم دانشوروں کو جنم دیا ہے جن کو پوری دنیا میں شہرت حاصل ہوئی۔ انہی فرزندانِ وطن کے عظیم کارناموں کا ذِکر کرنا ہم سب کے لئے باعث افتخار اور تاریخی ذمہ داری بھی ہے تا کہ ہمارے آنے والی نسل اور تاریخ کے طالب علم اپنے اِن مشاہیرِ کشمیر کے مقام اور مرتبے سے واقف ہوکر ماضی قریب اور ماضی بعید سے سبق بھی حاصل کرسکیں۔ اپنے اِن عظیم المرتبت شخصیات کے بارے میں مجھے یہاں پر مختصر تذکرہ کرنے میں بھی وقت کی تنگ دامنی حائل ہے ان کے مقام اور مرتبے کے بارے میں مزید تحقیق کرنا تاریخ کے طالب علموں اور محققین کا کام اور ذمہ داری بنتی ہے۔

میں نے ملک کشمیر کی ایک ایسی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے جس نے اپنی پوری زندگی اپنے من پسند صحافتی میدان میں گذاری ہے۔ یہ منفرد مزاج، پُرعزم اور ذی وقار شخصیت مغفور و مرحوم خواجہ ثنا اللہ بٹ صاحب کی ہے جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ تسلسل اور تواتر کے ساتھ اخبارِ آفتاب کی اشاعت قائم و دائم رکھی اور اپنے زورِ قلم سے قاری اور خبر کے درمیان تعلق پیدا کرنے اور اسے بنائے رکھنے میں جو دردمندانہ تگ ودو کی ہے وہ بلاشبہ کشمیر کی صحافتی تاریخ میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

مرحوم ثناء اللہ بٹ اور ادارہ آفتاب کے ساتھ میری وابستگی کی شروعات ۱۹۸۰ء کے ابتداء میں

ایک دلچسپ اور ایک قابلِ ذکر واقعہ کے تناظر میں ہوئی جب ۱۹۸۰ء کے اوائل میں ہی شہرِ سرینگر کے مختلف علاقوں میں دھماکوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور اُسوقت ریاستی پولیس نے ردعمل کے طور پر بم دھماکوں کے حوالے میں شہر خاص میں نوجوانوں اور طالب علموں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ انہی ایام میں مرحوم میر واعظ مولوی محمد فاروق صاحب کی اوّلین تصنیف ''اسلام کا آفاقی نظام'' کی رسمِ رونمائی کے لئے اسلامیہ ہائی سکول راجوری کدل کے تاریخی آڈیٹوریم میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں اُس وقت کے وزیرِاعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ، سید میر قاسم، وحید الدین ملک، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی سمیت متعدد اربابِ اقتدار موجود تھے۔

دوسرے دِن اخبارِ آفتاب میں خواجہ صاحب نے ایک نمایاں خبر بنا کر یہ سرخی چسپاں کر دی ''باضمیر شہری کی جُرات رندانہ، وزیرِاعلیٰ سے برجستہ سوال کیا'' جب کہ باقی اخبارات نے مجھے ایک سرکاری ملازم ہونے کے ناطے بھری مجلس میں حاکم وقت کو ایسا سیاسی سوال کرنے پر مجرم جیسا بنا کر یہ خبر شائع کی تھی۔ اس واقعہ کے بعد خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب کے ساتھ میرا تعلق باقاعدہ وابستگی میں بدل گیا جو اُن کے اِنتقال تک قائم و دائم رہا۔ اِن کے قریب جا کر مجھے اُس ہمہ جہت شخصیت کے چند گوشے دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا، اُن سب میں خواجہ صاحب کو کشمیر کا تشخص ہمیشہ عزیز رہا۔ وہ علامہ اقبال کے فکر وفن اور شاعری کے عاشقِ بے بدل تھے۔ وہ ان کے کلام کو کو از بر اور عزیز ترین سرمایہ علم وادب سمجھتے رہے۔ خواجہ صاحب اپنی بے پناہ یاداشت کی بدولت ہی ایک کامیاب، نڈر اور معتبر صحافی کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک محقق اور موررخ کا درجہ بھی حاصل کیا۔ انہوں نے ستائش، تمنا اور صلے کی آرزو کے بغیر ایک طویل عرصے تک اپنا قلمی مِشن جاری رکھا۔ اُن کی مجلس میں جب کبھی ستائش یا خودنمائی کا ذکر چھیڑا جاتا تو وہ فوراً یہ شعر کہتے تھے۔ ع

ہوس چھُپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

یہ وہ قلم کا مخلص اور دردمند سپاہی تھا جو نہ کبھی خوشامد سے اور نہ کسی لالچ سے خریدا جاسکا، جب کہ ان کو مرحوم شیخ صاحب نے ایکارڈ کے بعد آفتاب کو نیشنل کانفرنس کا آفیشل آرگن بنانے کی تجویز پیش کی تھی اور اُس کے عوض خواجہ صاحب کو اپنے وزارتی کونسل میں شامل کرنے کی حامی بھی بھر لی تھی،

جو بقول خواجہ صاحب اُن کو سننا بھی گوارا نہ ہوا۔ بخشی صاحب بھی اُن کو چیف پبلسٹی آفیسر بنا کر پارلیمنٹ میں بھیجنا چاہتے تھے مگر خواجہ صاحب خود کو عوام الناس کا ترجمان اور انہیں خدشات کے پیش نظر اخبارِ آفتاب کو کشمیری قوم کی امانت جان کر ہی اُنہوں نے اپنے اس مقبولِ خاص و عام ادارے کو ”آفتاب چیریٹیبل ٹرسٹ“ بنا کر قوم کے نام وقف رکھا۔ خواجہ صاحب علامہ اقبالؒ کے فلسفۂ حیات پر محکم یقین اور کامل ایمان رکھتے تھے جس کے سبب وہ وسوسوں اور توہمات کی اُلجھنوں میں نہیں پڑتے تھے، وہ راسخ العقیدہ شخصیت کے مالک تھے اور شاید اِسی وصف نے انہیں ان کے مشن کی راہ پر چٹان کی طرح مضبوط اور مستحکم رہنے میں مدد کی۔ لیکن جس طرح تاریخ انسانی میں معاشرے اور سماج کی فلاح کے لئے خود کو وقف کرنے والی بیشتر اعلیٰ شخصیتوں کو اپنی نجی زندگی کی خوشیوں کو قربان کرنا پڑا اِسی طرح خواجہ ثناء اللہ مرحوم کو بھی اپنے مقاصد اور صحافتی مِشن کو جاری رکھنے کیلئے اپنی نجی زندگی کو قربان کرنا پڑا۔ یہ اُن کی زندگی کا وہ غمناک پہلو تھا کہ اُن کی گھریلو اور ازدواجی زندگی مکمل طور پر ناکام رہی مگر اُنہوں نے یہ بات آخری دم تک قبول نہیں کی۔ وہ اپنی نجی زندگی گزارنے کے لئے مشفقانہ مزاج نہ ہونے کی سبب اپنا گھر آباد نہ کر سکے جب کہ خواجہ صاحب اپنی عمر کے آخری ایام میں اُس کمی اور اکیلے پن کو شدید طور پر محسوس کرتے رہے۔ انہی ایام کی ایک نشست میں، میں نے جب خواجہ صاحب کو نہایت ہی رنجیدہ اور یاسیت میں ڈوبا ہوا پایا تو میں نے اُن سے پوچھا خواجہ صاحب آج آپ خلافِ معمول بہت مغموم اور مایوس لگتے ہیں ایسی کیا بات ہوئی ہے، تو آپ نے کہا کہ اکیلے پن اور احساس محرومی نے جیسے دل و دماغ پر قبضہ جما رکھا ہے۔ خواجہ صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھ پر بھی کچھ دیر ایک عجیب سی مایوسی چھا گئی کچھ دیر کے بعد میں نے بھی اپنے آپ کو سنبھال کر خواجہ صاحب سے کہا۔ حضرت یہ مقام تنہائی اور اکیلا پن آپ نے اپنے لئے خود ہی قبول کیا ہے۔ یہ تو کسی نے آپ پر زبردستی ٹھونسا تو نہیں ہے جس پر آپ آج اِتنے مغموم اور بیزار بیٹھے ہیں۔ اِن کو اُس وقت کی اُس پریشانی سے خلاصی دِلانے کے لئے میں نے اور بھی بہتر کچھ اکیلے پن کی خوبیاں اُن کو سنائی مگر وہ ایک انتہائی حساس اور تجربہ کار شخصیت کے مالک تھے۔ یہ سُن کر صرف انہوں نے مجھے اتنا کہا کہ ”آپ کو یہی کہنا ہے اور یہی کہنا بھی چاہئے۔“

یہ خواجہ صاحب کی خداداد ذہانت، صلاحیت اور بے پناہ مہارت ہی کا اعجاز تھا کہ اپنی انا پرستی، تند مزاجی اور تلخ گوئی کے باوجود یہ خدا کا بندہ تنِ تنہا وادیٔ کشمیر میں نصف صدی تک ایک اخبار کو نہ صرف زندہ رکھنے اور بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہا بلکہ اس سے گھر گھر کی آواز بنانے میں بھی کامیاب وکامران ہوا۔ یہ وہی پختہ اِرادے اور معتبر قلم کا سپاہی ہے جس نے برابر نصف صدی تک تسلسل کے ساتھ ہر دن نہ صرف اپنے اخبار آفتاب کی نوک پلک ہی سنواری بلکہ خود ہی اداریہ، سُرخی، ذیلی سرخیاں خبر زینہ کدل، جلیل جالکدوز، پری محل اور مشہور زمانہ طنزیہ کالم "خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" آخری دم تک لکھتا رہا۔ حالانکہ ان کے اس مزاحیہ کالم کے حوالے سے بعض افراد کو یہ اعتراض بھی رہا کہ اس کالم میں چھپے تیر ونشتر سے خواجہ صاحب نے چند سیاسی، سماجی، ملی اور اپنے مخالفین کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں اور رفقاء کو بھی نشانہ بنایا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ جب بھی حالات وواقعات کے دباؤ سے خواجہ صاحب کو سنجیدہ طرزِ تحریر کے ذریعے حقائق کی عکاسی کرنے میں رکاوٹ محسوس ہورہی تھی تو انہوں نے اُس وقت اسی مزاحیہ کالم کے سہارے اپنا مافی الضمیر بیان کردیا، اخبارِ آفتاب کے بارے میں بلاخوف وتردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ ریاستِ جموں وکشمیر کا واحد اخبار ہے جو تقسیمِ کشمیر کے المناک سانحہ سے لے کر آج تک یہاں وقوع پذیر ہوئے تمام اہم سیاسی واقعات اور سماجی ومعاشرتی تبدیلیوں کا معتبر گواہ بھی ہے۔

آفتاب کے اوراق میں جھانک کر ملکِ کشمیر کی پچاس سالہ دور پر مشتمل ایک مستند تاریخ رقم کی جاسکتی ہے۔ اخبارِ آفتاب کی بے باک تحریروں کے معترف اِس کے اپنے خیر خواہ ہی نہیں بلکہ اس کے مخالفین بھی ہیں۔ ایک معتبر کشمیری پنڈت صحافی نندلال واتل نے مدھیہ پردیش سے خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب کے نام ایک مفصل مکتوب میں اس حقیقت کا برملا اظہار اور اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اخبارِ آفتاب نے اپنے وجود میں آنے سے لے کر اَب تک کشمیر اور کشمیریت کے حوالے سے جس نظریے کی آبیاری کی وہ بالآخر وقت نے صحیح ثابت کردکھایا ہے"۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جموں وکشمیر کی تاریخ جہاں کہیں بھی رقم کی جائے گی وہ تب تک نامکمل تصور کی جائے گی جب تک نہ اِس میں پچاس سال پر محیط خواجہ ثناء اللہ بٹ اور اخبارِ آفتاب

کے سفر کا تذکرہ نہ ہوگا، یہ سفر بلاشبہ شاندار رہا ہے البتہ یہ کہنا بھی حقائق سے انحراف کے مترادف ہوگا کہ مادیت کے موجودہ دور میں آفتاب بھی خود کو اس کے منفی اثرات سے بچانے میں ناکام رہا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تجارتی مفادات اخبارِ آفتاب کے اِن عظیم مقاصد پر حاوی ہو رہے ہیں جن کی یہ اخبار مسلسل پچاس سال سے آبیاری کرتا آیا ہے۔ اخبار کی اس مایوس کُن صورتحال کی ایک وجہ خود خواجہ صاحب کی علالت بھی رہی ہوگی اور دوسری اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اخبارِ آفتاب کی تمام تر خوبیوں اور کامیابیوں کے باوجود ہونہار اور صحافت کے جدید تقاضوں سے آشنا باسند اشخاص اِس ادارے میں دائمی طور ٹِک نہیں پائے یا دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صحافت کی اِس معتبر اور قدیم درسگاہ سے فیض اُٹھانے والے لوگوں نے بھی اس عوامی اِدارے کو دوام بخشنے کے لئے اپنی خدمات بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کہ نجی اور صحافتی زندگی کی ایسے ہی منفی پہلوؤں سے دِل برداشتہ ہوکر ہی خواجہ صاحب نے اپنی وصیت میں لکھا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد اُن کی قبر پر یہ شعر لکھ دیا جائے۔

چمن کے رنگ و بُو نے اس قدر دھوکے دیئے مجھ کو
کہ میں نے شوقِ گلبوسی میں، کانٹوں پر زباں رکھ دی

خواجہ صاحب نے آفتاب کی عمارت کھڑی کرنے میں ایک ایک اینٹ عرق ریزی سے چُنی ہے اور اس کی نگرانی اور نگہبانی نہایت ہی ہوشیاری اور ذمہ داری سے کی، جیسے دانشمند اور روشن خیال والدین اپنے بچوں پر نگاہ رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا کوئی قدم ڈگمگا نہ جائے۔ ادارہ آفتاب آج ایک تناور چنار کے درخت کی طرح ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی جوانی کی ساری خوشیاں اور مسرتیں بالخصوص اپنی ازدواجی زندگی بھی اخبار آفتاب پر ہی قربان کیں اور خود صوفیوں اور ریشیوں کی طرح کثرت میں وحدت کا نمونہ بن کر اپنے لئے بے مثال توشہ آخرت اور صدقہ جاریہ چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے ملے۔ خداوند تعالیٰ اُن کے حسنات و درجات بلند کرے۔



☆...... عبداللہ خاورؔ

سماجی بہبود کا ترجمان

تیس بتیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں شاعری کا جنوں سر پہ سوار تھا۔ شاعری کیا، تُک بندی کہیئے۔ اس سے زیادہ جنوں یہ تھا کہ یہ کہیں چھپ جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ مبتدیوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اخبار ''آفتاب'' موزوں ہے۔ چنانچہ میں اپنی مبتدیانہ غزل لے کر ''آفتاب'' کے دفتر پہنچا۔ ہم جیسے نومشقوں کے لئے ایڈیٹر تک رسائی ناممکن تھی۔ آفس میں کئی حضرات بیٹھے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، ایک نستعلیق قسم کے شخص جن کا نام تو کیا اب شکل بھی میرے ذہن میں موجود نہیں، ایک بڑی کرسی پر براجمان تھے۔ ان کے پاس آیا اور سلام و نیاز کے بعد کانپتے ہاتھوں سے اپنی غزل ان کے ہاتھوں میں تھمادی۔ انہوں نے اپنی عینک کو جو ناک کے نچلے سرے پر ٹکی ہوئی تھی اوپر سرکا کر بڑی بے اعتنائی سے غزل پڑھنی شروع کی۔ غزل پڑھ کر عینک کو اپنی پہلی جگہ پر ٹکا کر عریاں آنکھوں (Nude Eyes) سے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔

''یہ آپ نے لکھی ہے؟''

عرض کیا: ''جی ہاں، میں نے ہی لکھی ہے۔''

وہ کچھ بڑبڑائے۔ موصوف کی غیر پسندیدہ بڑبڑاہٹ میری سمجھ میں نہ آئی...... میں نے عرض کیا ''کچھ فرمایا آپ نے؟''

''جی نہیں، آپ تشریف لے جایئے...... آپ کی غزل کو ہم دیکھ لیں گے''۔

مجھے صرف تین دن انتظار کرنا پڑا۔ چوتھے دن جب میں نے آفتاب میں اپنے نام سے چھپی غزل دیکھی تو خوشی سے زیادہ حیرانی تھی۔ حیرانی اس لئے کہ اس مبتدیانہ غزل کو اشاعت کے قابل

سمجھا گیا۔ ہجر و وصال کی محض سنی سنائی باتیں تھیں جنہیں میں نے نظم کیا تھا۔ البتہ اس غزل کا ایک شعر بزرگ دوستوں نے کافی سراہا۔ گو سخن گوئی سے اب میل نہیں تاہم اس غزل کا وہ شعر اب تک میرے ذہن پر نقش ہے۔

فسردہ کبھی ان کا چہرہ جو دیکھا
ندامت سے اپنے ستم یاد آئے

اس کے بعد جب بھی کبھی کوئی تحریر آفتاب کے دفتر لے کر جاتا، وہ ضرور شائع ہو جاتی۔ اس بات کا علم مجھے کافی مدت کے بعد ہوا کہ مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب نومشقوں کی ہمت افزائی کرتے اور ان کی املا کی نک سِک کی درستی بھی کرتے ہیں۔...... واللہ اعلم۔ یہ کہنے میں دورائیں نہیں کہ عصرِ حاضر کے کئی معروف قلمکاروں نے اپنی جو ایک پہچان بنائی ہے وہ اخبار ''آفتاب'' ہی کا فیضان ہے۔

''خضر سوچتا ہے وِلر کے کنارے'' شاعرِ مشرق کا یہ معروف مصرعہ اخبار ''آفتاب'' کا مستقبل کالم رہا ہے۔ اس کالم کے ذریعہ خواجہ صاحب سماجی برائیوں اور سماج دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ہمارے کئی احباب اس کالم کی زبان پر انگلی اٹھاتے ہیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ خواجہ صاحب نے مزاحیہ پیرایہ میں سماجی برائیوں اور سماج دشمنوں کے خلاف جتنے تیر چلائے ہیں، وہ ہمیشہ نشانے پر بیٹھے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تیر خطا بھی ہو جاتے ہیں لیکن خواجہ صاحب اس پر کم ہمت نہیں ہوتے بلکہ تازہ دَم ہو کر تیر چلانے کی مشق جاری رکھتے ہیں جو بالآخر ہدف میں پیوست ہو ہی جاتے تھے۔ سماج دشمن کسی بھی طبقے یا ادارے سے تعلق رکھتے ہوں، وہ موصوف کی شدید مگر بے لوث اور مخلصانہ تنقید سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے تھے۔ وہ آخری دم تک ان کا پیچھا کرتے تھے۔ حکومت کے ایوانوں تک عوام کے مطالبات اور ان کی خواہشات پہنچانے کے لئے انہوں نے کبھی کوئی سودا نہیں کیا، کبھی حکومت کے خلاف، کبھی اصحابِ اقتدار کے خلاف، کبھی اپنی برادری کے خلاف اور کبھی سماج کے دشمنوں کے خلاف، خواجہ صاحب زندگی بھر چومکھی لڑتے رہے ہیں اور اس صورتحال میں انہوں نے اپنے سود و زیاں کی کبھی فکر نہ کی۔ اخبار آفتاب حکومت کی غفلت شعاری، سماج دشمنوں اور سماجی

برائیوں کے خلاف ایک موثر اور نمایاں آواز رہی ہے۔اور یہی اس کی پہچان اور پالیسی ہے۔

''آفتاب'' کی عمارت کھڑی کرنے میں خواجہ صاحب نے ایک ایک اینٹ چُنی ہے۔ پچاس سال تک کامیابی کے ساتھ اخبار جاری رکھنا کوئی عالمی ریکارڈ ہو یا نہ ہو، موصوف کی مستقل مزاجی اور صحافت میں اعلیٰ اخلاقی اقدار قائم رکھنے کی ایک نادر مثال ضرور ہے۔

اب سے چھ دہائی قبل اردو صحافت کا مزاج زیادہ ادبی ہوا کرتا تھا۔ایک ایڈیٹر کے لئے شاعر اور ادیب ہونا شرط سمجھا جاتا تھا۔لیکن آہستہ آہستہ یہ روش کم ہوتی گئی۔اخبار ''آفتاب'' کو 'اخبار' ہی کی حیثیت سے پیش کیا۔غالباً یہی وجہ ہے کہ کشمیر کا معمولی پڑھا لکھا شخص صبح کے ناشتہ کے ساتھ اخبار ''آفتاب'' پڑھنا لازمی سمجھتا تھا جو اس اخبار کی مقبولیت کی واضح علامت ہے۔



☆...... محمد صدیق

خواجہ صاحب۔ ہمدرد و ہم نوا

خواجہ صاحب اخباری دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے انہوں نے سرکاری نوکری ٹھکرا کر اخبار نویسی اختیار کر لی تھی۔ اس وقت کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے لاکھ جتن کئے کہ خواجہ صاحب اخبار نہ نکالیں اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ اخبار کے لئے بہت پیسہ ہونا چاہیئے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ خواجہ صاحب پر اخبار نکالنے کی دھن سوار تھی جو انہوں نے پوری کر دی۔ اخبار شائع کرنے کے لئے سٹاف کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے انہوں نے سب سے پہلے میرا انتخاب کیا۔ میں دہلی میں اخبار ''نئی دنیا'' میں معاہدہ ختم کر کے واپس سری نگر آیا تھا اور نوکری کے لئے محکمہ انفارمیشن میں درخواست دے دی تھی۔ انہوں نے آفتاب کی کتابت کے لئے اخبار کا سارا مواد میرے حوالے کر دیا۔ اس طرح اخبار آفتاب کا پہلا شمارہ عوام کے سامنے آیا۔ چند شمارے نکالنے کے بعد خواجہ صاحب کہا کرتے تھے کہ ہفت وار اخبار نکالنے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو ان کے ذہن میں ہے اس لئے اسے روزنامہ ہونا چاہیئے۔ انہوں نے آفتاب کو روزنامہ بنانے کے لئے مجھ سے ایک پوسٹر لکھوایا جو شہر سری نگر اور دیہاتوں میں چسپاں کئے گئے اس کے ساتھ ہی بڑے بورڈ شہر و دیہات کے چوراہوں اور بازاروں لگوائے گئے۔ اخبار نکالنے کی ایک نئی شروعات ہوگئی۔ اس نئی شروعات کے تخلیق کار صرف خواجہ صاحب ہی تھے۔ روزنامہ ہو جانے کے ساتھ ہی آفتاب کا حلقۂ احباب بھی بڑھنے لگا۔ خاص طور پر ان کے ساتھی جو ان کے ساتھ پُش بیک کئے گئے تھے روزانہ دفتر میں دکھائی دینے لگے۔ دو آبگاہ کے خواجہ امیر الدین اور سوپور کے ولی محمد، خواجہ صاحب جو کچھ اخبار کے لئے لکھتے تھے۔ وہ پہلے امیر الدین

صاحب کو دکھاتے تھے کبھی کبھی امیر الدین صاحب مسودہ کو دیکھ کر خواجہ صاحب کو مشورہ بھی دیا کر تے تھے۔ خواجہ صاحب ریڈیو کشمیر کے لئے بھی لکھنے لگے۔ وہ کہتے تھے اس کے معاوضے کے طور جو پیسے ملیں گے اس سے اخبار کو مدد ملے گی لیکن خواجہ صاحب نے کسی بھی شخص یا کسی دوست کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے اور اخبار کسی بھی صورت میں بند نہیں ہونے دیا۔ ان کے حلقہ احباب میں کئی شخصیتیں شامل ہو گئیں جن میں اخبار ہمدرد کے غلام رسول عارفؔ، اخبار روشنی کے عزیز کاشمیری، اخبار پیامِ انقلاب کے خواجہ غلام محمد بٹ، ڈیلی ٹیلی گراف لنڈن کے نمائندہ خصوصی جگن ناتھ ستھو، ریڈیو کشمیر کے شیام کول (شیام جی)، بنسی نردوش (ریڈیو کشمیر)، چمن لال چمن (کلچرل اکیڈیمی) مظفر خان (انفارمیشن) اور خصوصی طور پر شمیم احمد شمیم اور محمد یوسف ٹینگ تھے۔ ان اصحاب کے علاوہ کئی سیاسی اور سماجی لوگ بھی خواجہ صاحب کے پاس آنے لگے لیکن یہ سب زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکے ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ خواجہ صاحب اپنے اخبار کو عام لوگوں میں ہر دل عزیز بنانے کے لئے بہت کچھ کرتے تھے۔ ایک بار میرے ہاتھ میں ''مجاہدین سسلی'' نامی کتاب دیکھی۔ انہوں نے یہ ساری کتاب قسط وار اخبار میں شائع کر دی بس پھر کیا تھا اخبار کی مانگ بڑھ گئی۔ اخبار کی مانگ بڑھتے ہی انہوں نے ایڈیٹوریل صفحہ میں'' خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کے کالم کے ساتھ ساتھ ایک اور کالم کا اضافہ کر دیا۔ ''باعث تحریر آنکہ'' کے نام کے کالم میں عوامی مسائل طنز و مزاح ابھارے گئے۔ خوش قسمتی سے یہ کالم لکھنے کے لئے مجھے دیا گیا۔ کتابت کے ساتھ ساتھ کالم نگاری اور وہ بھی مزاحیہ انداز میں لکھنا بڑا مشکل کام تھا اس کے علاوہ ہاکروں سے اخبار بیچنے کے پیسے وصول کرنا اور نیوز ایجنٹوں کا حساب رکھنا یہ سب کچھ کرنا میرے لئے آسان نہیں تھا۔ مضامین کی اصلاح وغیرہ بھی میرے ذمہ کر دی گئی۔ کا م کی زیادتی کی شکایت پر خواجہ صاحب نے مجھے سمجھایا کہ تم ابھی چھوٹے ہو اور اس عمر میں جتنا زیادہ کام کرو گے اتنا آگے چل کر فایدہ ملے گا۔ خواجہ صاحب نے نوجوانوں کو ترغیب دی کہ وہ اخبار کے لئے لکھیں، اس سلسلے میں بہت سے نوجوانوں نے باضابطہ لکھنا شروع کر دیا۔ ان میں عبدالاحد فرہاد، م م صدیق، شمس الدین شمیم، جان محمد آزاد، یاسین فردوسی وغیرہ شامل ہیں۔ خواجہ

صاحب نے ان نئے لکھنے والوں کی زبردست حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجہ میں ان نوجوانوں نے ذوق وشوق سے لکھنا شروع کیا۔ آفتاب لکھنے والوں کے لئے تربیت گاہ بھی بن گیا۔ یونیورسٹی کے اساتذہ عبدالغنی مدہوش، پروفیسر بشیر احمد نحوی بھی آفتاب کے خصوصی لکھنے والوں میں تھے ۔''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کا کالم پہلے پہل غلام رسول نازکی نے لکھا۔ دو تین شماروں کے بعد خواجہ صاحب نے خود یہ کالم لکھنا شروع کر دیا اور وہ اس میں زبردست کامیاب بھی ہوئے۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ آفتاب خضر کی وجہ سے ہی پڑھا جانے لگا۔ پروفیسر شیدا نے بھی خضر لکھنے کی کوشش کی لیکن ہر روز لکھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ خواجہ صاحب نے مرتے دم تک خضر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ خضر میں وہی دم خم تھا، وہی جوش ُ وہی جذبہ' وہی رعنائی تھی جو آغاز میں اس میں موجود تھی حالانکہ خواجہ صاحب آخری دنوں علیل تھے۔ خواجہ صاحب نے کبھی بھی خضر کی ہیئت بگاڑنے نہیں دی۔ کلچرل اکیڈیمی کے ادیب اور کشمیری شیرازہ کے سابق ایڈیٹر چمن لا ل چمن کسی کام کے لئے آفتاب کے دفتر میں آئے پھر یہاں کے ہی ہو گئے۔ پہلے پہل ان سے کہا گیا کہ وہ اخبار کے لئے ایک قطعہ لکھیں۔ یہ قطعہ وقت اور حالات کے مطابق ہونا چاہئے، انہوں نے لکھا لیکن روز روز ایک بھر پور قطعہ لکھنا چمن جی کو بار گراں گزرا۔ خواجہ صاحب کو اس کی مجبوری محسوس ہوئی تو فوراً مراسلے اور چھوٹی چھوٹی خبریں لکھنے کی طرف انہیں راغب کیا۔ چمن لال چمن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنا کام سلیقے کے ساتھ خاموشی سے انجام دیتے تھے۔ برعکس، بنسی نردوش جب کچھ لکھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی جنتری یا علم نجوم کی کتاب میں مختلف ستاروں کے برجوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ کاتب حضرات بنسی نردوش کی لکھائی کو اچھی روشنی میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی لکھائی بڑی مشکل سے پڑھی جاتی تھی۔

خواجہ صاحب نے آفتاب کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا جو مقام کسی کو حاصل نہیں ہوسکا جس کے نتیجہ میں دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمنوں کی تعداد بھی بڑھ گئی جو آفتاب کو نقصان پہچانے کے لئے جو بن پڑتا وہ کر گزرتے لیکن خواجہ صاحب نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ کہا کرتے

تھے جب آتشِ نمرود میں کودنا ہے تو ڈرنا نہیں چاہئے۔ دشمنوں نے حد ہی کر دی کہ جب تھانہ مائسمہ کی طرف سے خواجہ صاحب کو ہتھکڑی پہنا دی گئی۔ خواجہ صاحب کے چہرے پر کوئی تغیر دکھائی نہ دیا انہوں نے ہتھکڑی پہنانے والے سے کہا کہ اب مجھے تھانے چلنا ہے جب سپاہی نے اثبات میں سر ہلایا تو خواجہ صاحب نے کہا کہ مجھے بجائے گلی کوچوں کے سڑک سے ہی تھانے لے جایا جائے جس کا مقصد غالباً یہ تھا ہتھکڑی پہنے سبھی لوگ دیکھ لیں اور انہیں اس کا احساس ہو کہ اخبار نویسوں کو کیا کچھ سہنا پڑتا ہے۔ اس کمال جرأت مندی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اس جرأت رندانہ کے مالک کم ہی ملتے ہیں۔ اس موقعے پر دشمنوں کا مقابلہ کے لئے اخلاقیات اور دوسرے علوم کافی نہیں بلکہ فولادی اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس کو کوئی بڑا واقعہ نہیں سمجھتے ہیں لیکن کسی معزز شخص کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آنا بہت بڑی بات ہے۔ خواجہ صاحب نے اخبار نویسی کے میدان میں اسی طرح کمال جرات مندی دکھائی اور مقابلہ کرتے رہے اس طرح انہوں نے دوسرے اخبار نویسوں کو کامیابی کی منزلوں کی طرف رہنمائی کی تاکہ اس پیشے سے وابستہ افراد عزت و آبرو سے اپنا کا انجام دیں۔ ایک دن میرے بڑے بھائی عبدالاحد خواجہ صاحب کی خدمت میں آئے تو خواجہ صاحب نے علیک سلیک کے بعد پوچھا کہ یہ کون ہے جو تمہارے ساتھ ہیں۔ عبدالاحد نے کہا کہ یہ میرے ساتھی ہیں میرے ساتھ محکمہ بجلی میں کام کرتے ہیں ان کا نام عبدالحمید خان اور یہ بٹہ مالو میں رہتے ہیں۔ دوسرے دن حمید صاحب کو خواجہ صاحب نے اخباری کام پر لگا دیا۔ حمید صاحب خواجہ صاحب سے ڈیکٹیشن لے کر خضر اور دوسری خبریں کاتبوں کے حوالے کرتے رہے، کچھ عرصے سے خواجہ صاحب اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھ پاتے کیونکہ ان کے ہاتھ میں رعشہ آ گیا تھا۔ حمید صاحب انتہائی شریف اور مخلص انسان تھے۔ کبھی ان کے چہرے پر غصے کی معمولی سی لکیر بھی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ لڑائی جھگڑے کی بات دور کی رہی۔ حمید صاحب کے بارے میں خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ ہم یہاں ایک پست زندگی شروع کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ادھر ادھر کی باتیں سیکھتے ہیں مثلاً شریف ہونا، فیاض ہونا، نیکی کے راستے پر باہمت اور دلیر ہونا بے غرض اور دانش مند ہونا اور اپنی تمام

خواہشات اور جذبات پر قابو رکھنا اس طرح ہم نفیس دل پسند انسان بن جاتے ہیں۔ حمید صاحب نے اس طرح جو دنیا تعمیر کی ہے اس سے ہم یقیناً محبت کرتے ہیں۔ حمید صاحب نے اچھا وقت آفتاب میں گزارا پھر پتہ چلا کہ حمید صاحب بیمار پڑ گئے اور پھر مختصر علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خواجہ صاحب کو حمید صاحب کا چلے جانا بہت دنوں تک محسوس ہوا اور وہ ایک اچھے دوست کی کمی کا احساس کرتے رہے۔

آخر پر میں اپنے مختصر مضمون کو اس بات پر ختم کرتا ہوں کہ خواجہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی پہلو ہیں جن کے لئے سینکڑوں صفحات سیاہ کرنے پڑیں گے جو شاید میرے بس کی بات نہیں۔



☆...... شمس الدین شمیم

خواجہ ثناءاللہ بٹ۔ شفیق و رفیق محسن

روزنامہ آفتاب کا ادارہ ایک انجمن رہا ہے جس میں گرما گرم سیاسی مباحثے اور سماجی معاملات کے بارے میں غور وفکر ہوا کرتا تھا۔ اس انجمن کے خدوخال کیسے تھے؟ خواجہ صاحب کہاں بیٹھتے تھے؟ اُن کے اطراف میں کون لوگ بیٹھتے تھے، اس کے بارے میں رقم کرنا نہایت ہی ضروری ہے کیونکہ روزنامہ آفتاب کا انفرادی کردار نئی نسل کے گوش گزار ہونا چاہئے۔

ایک منزل پر پھیلے اور کئی کمروں پر مشتمل آفتاب کے ادارے میں ایک کمرہ ایک چھوٹے سے ہال کے برابر تھا جس کے ایک کونے میں بہت ہی قرینے سے سجایا ہوا ٹیبل اور اونچے قد کی کرسی تھی جس پر بہت ہی نفیس ترین سوٹ اور ٹائی پہنے خواجہ صاحب بیٹھتے تھے۔ ان کے بائیں ہاتھ کی جانب دیوار پر Oil Paint سے بنایا گیا پوری دنیا کا نقشہ نصب تھا جسے بعد میں خواجہ صاحب کے ذاتی کمرے میں لایا گیا اور وہ اب بھی وہیں موجود ہے۔

۱۹۷۵ء کے آس پاس کی بات ہے کہ خواجہ صاحب کے دفتر کے اس چھوٹے سے ہال میں کچھ صوفے اور کچھ میز کرسیاں بھی تھیں جن پر آفتاب کے لئے نیوز بنانے والے بیٹھتے تھے۔ ان میں محکمۂ اطلاعات کے انفارمیشن آفیسر محی الدین علاقہ بند، کلچرل اکادمی میں کشمیری ''شیرازہ'' کے ایڈیٹر اور شاعر چمن لعل چمن، ریڈیو کشمیر سرینگر کے سکرپٹ رائٹر اور ممتاز ڈرامہ نویس بنسی نردوش شامل تھے اور دروازے کے ساتھ ایک چھوٹے سے میز کرسی پر میں سہما سہما سا بیٹھا کرتا تھا اور وہیں پر

بیٹھے ہوئے سر جھکائے کنکھیوں سے اس چھوٹے سے ہال میں بیٹھنے والی شخصیات کے کلام، حرکات و سکنات اور چائے کی چسکیوں کا جائزہ لیتا تھا۔ واقعی مجھے آفتاب ایک انجمن دکھائی دیتا تھا اور اس چھوٹے سے ہال کے ایک کونے میں خواجہ صاحب ایک کشمیری گلاب کی مانند اپنی خوشبو بکھیرتے رہتے تھے۔

اس انجمن میں نہ صرف شہری، وکلاء، امراء، غرباء، ادباء، شعراء خواجہ صاحب سے ملنے آتے تھے، بلکہ یہ انجمن صحافت سے وابستہ کئی شخصیات سے بھی روز سجی رہتی تھی جن میں دلی کے انگریزی روزنامہ Statesman کے پہلے Full Time نامہ نگار آر۔ کے کاک، روزنامہ خدمت کے مدیرِ اعلیٰ نندہ لعل واتل، جموں کے پہلے اخبار نویس ملک راج صراف، ان کے صاحبزادے اوم صراف، دلی کے اخبارات کے نامہ نگار بانیال صاحب، برج بھار دواج، وی کے ڈیتھے، سیاسی رہنما اور ہفت روزہ خالدِ جدید کے مدیر خواجہ صدر الدین مجاہد، روشنی کے مدیرِ اعلیٰ عزیز کشمیری، آئینہ کے ایڈیٹر اور ممبر پارلیمنٹ شمیم احمد شمیم، کلچرل اکادمی کے سابق سیکریٹری محمد یوسف ٹینگ، روزنامہ ہمدرد کے ایڈیٹر خواجہ غلام رسول عارف، روزنامہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر خواجہ محمد شفیع سمنانی، خدمت کے خصوصی نامہ نگار اور روزنامہ آفاق کے مدیرِ اعلیٰ محمد یوسف قادری، کے این ایس نیوز سروس کے پرتھوی ناتھ رینہ، ممتاز صحافی شیام کول، کئی کتابوں کے مصنف اور ہفتہ روزہ محافظ کے مدیر رشید تاثیر، محکمۂ اطلاعات کے ڈائریکٹر بخشی غلام علی، کے ایل دھر، مظفر خان، سعودی گزٹ کے نامہ نگار خواجہ غلام نبی الدین گلکار، ''پیام انقلاب کے ایڈیٹر غلام محمد بٹ، محمد امین پنڈت، ''چنار'' کے مدیر محمد امین بیڈھ، محکمۂ اطلاعات کے ڈپٹی ڈائریکٹر غلام نبی طوری، امرت بازار پتریکا کے نامہ نگار بی ایل کاک، ڈیلی ٹیلی گراف لندن کے سرینگر میں مقیم نمائندے جے این ستھو، Patriot انگریزی روزنامے کے خصوصی نمائندے محمد سعید ملک کے علاوہ ممتاز صحافی وجیہہ احمد اندرابی، روزنامہ عقاب کے منظور انجم، قلمکار ظریف احمد ظریف اور محمد یوسف مسکین کے سمیت دیگر کئی اصحاب شامل تھے۔ ان شخصیات کا آفتاب میں ہر روز آنا جانا رہتا تھا۔ ان کے لئے چائے وغیرہ لانے کے لئے ایک نوجوان لڑکا عبدالعزیز تیار بہ تیار رہتا تھا۔ لالچوک کے انٹرنیشنل ہوٹل سے بھنی ہوئی کانتیاں منگوانا بھی ایک

معمول تھا۔خواجہ صاحب بھنی ہوئی کانتی کھانا بے حد پسند کرتے تھے۔روز مرہ کا یہ ماحول کسی اور اخبار میں نہیں تھا۔ایسی کوئی روایت دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔آفتاب کے کتابت سیکشن میں بیٹھے ہوئے قلم کار خواجہ محمد صدیق، سینئر کاتب خواجہ غلام رسول آف اخراج پورہ، خواجہ غلام نبی مہاجن، شبیر احمد رضوی، بشیر احمد آف محکمہ اطلاعات، ان کے والد خواجہ غلام رسول بٹ اور خواجہ محمد رمضان قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات کتابت بھی کرتے تھے اور مذکورہ شخصیات کے ساتھ نوک جھونک اور بحث و مباحثے میں بھی شرکت کرتے تھے۔ بڑا خوبصورت ماحول تھا۔وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں کرتا تھا۔

لیکن افسوس وہ بحث وتکرار اور گرم گرم سیاسی گفتگو، چائے کی چسکیاں، ایک تاریخ بن گئی ہے۔

خواجہ صاحب کے دوست، احباب اور رشتہ داروں میں اکثر خواجہ عبدلاحد، شیخ عبدالحمید، گُل پان ہاوس کے مالک خواجہ غلام محمد، خواجہ عبدالصمد آف شیزان ہوٹل، شیخ عبدالرحیم، Cheap Stores کے مالک شیخ غلام رسول، جی ایم نظامی، غلام قادر بیگ، خواجہ علی محمد، خواجہ غلام احمد بزنس مین اور نظام الدین قریشی ہر روز شام کو آفتاب میں حاضری دینے آتے تھے۔ایک بار جب بنسی نردوش ایک دو دن آفتاب کے دفتر نہیں آئے تو خواجہ صاحب نے اخبار میں گمشدگی کا اشتہار دیدیا۔

خواجہ صاحب قدرے سنجیدہ تھے لیکن بڑے دوست نواز، بڑے احباب نواز، کام کرنے کے دوران بھی اطراف میں یار دوستوں کا جمع ہونا بھی بہت ضروری سمجھتے تھے۔روز نامہ آفتاب میں کارٹون بھی شائع ہوتے تھے اور کارٹون خواجہ محمد صدیق کے چھوٹے بھائی مشہور آرٹسٹ جی احمد صاحب بناتے تھے۔آفتاب ادارے میں خواجہ صاحب کی باوقار اور سنجیدہ شخصیت کے نتیجے میں نظم وضبط بڑا بے مثال تھا۔کتابت سیکشن ہو یا انتظامیہ، یا اخبار کی بکری سے وابستہ عملہ ہو، سب بڑی باقاعدگی اور ایک ڈسپلن کے تحت کام کرتے تھے۔آفتاب کے ادارے میں منیجر کے عہدے کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔۱۹۷۵ء کے آس پاس خواجہ محمد صدیق کے ایک قریبی رشتہ دار خواجہ محمد خلیل آفتاب میں منیجر رہے ہیں جبکہ ممتاز افسانہ نگار عمر مجید کے ممبئی کی فلمی دنیا چھوڑ کر آئے۔ماموں گل محمد صاحب بھی آفتاب میں کئی سال تک منیجر رہے۔ان کے بعد آفتاب میں یہ عہدہ خواجہ عبدالسلام نے سنبھالا۔ان کے بعد تادم ایں خواجہ غلام نبی جنرل منیجر ہیں اور سبھی منیجروں میں خواجہ غلام نبی کافی دیر سے وہاں

کام کر رہے ہیں اور آفتاب کو عزیز تصوّر کرتے ہیں۔

آفتاب میں کام کرنے کے دوران میں نے خواجہ صاحب کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔انہوں نے آفتاب کو ایک سکول، ایک درس گاہ بنا دیا تھا۔آج مجھے خواجہ صاحب کے انتقال سے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ وادی میں اردو صحافت کے میدان میں ابھرنے والی نئی نسل تربیت کے ایک سکول سے محروم ہوئی ہے۔

روز نامہ آفتاب میں چھپنے والا ایک ایک لفظ خواجہ ثناء اللہ بٹ کی نظروں سے گزرے بنا نہیں چھپ سکتا تھا اور یہیں سے آفتاب میں آئے صحافت سے وابستہ نئے چہروں کی تربیت کی شروعات ہوئی تھی۔ان نئے چہروں میں ، میں بھی شامل رہا ہوں۔اگر کوئی نیا چہرہ کوئی Story کوئی سرخی یا کوئی مضمون خواجہ صاحب کے ٹیبل پر رکھ دیتا تھا تو خواجہ صاحب نے News سے تذکیر و تانیث، جملے کی ترکیب، نیوز کے متن میں اوپر نیچے یا نیچے اوپر کے Fountain Pen پریگرافوں کو صحیح ترتیب دیتے۔جملے کی بناوٹ یا سرخی میں کشش پیدا کرنے کے حوالے سے درستی کرتے ۔ایک بار میں نے کافی ہاؤس کا ذکر کیا تھا تو خواجہ صاحب نے کہا کہ کافی ہاؤس ایسے نہیں لکھتے ۔تلفظ کو مدنظر رکھو اور کہا کوفی ہاؤس لکھو۔اس طرح سے نیا چہرہ، نیا صحافی ایسی ہدایات کو اپنے تحت وشعور میں نقش کر جاتا تھا۔صحافت کے میدان میں داخل ہوئے نئے چہرے کے لئے یہی تربیتی کورس تھا۔خواجہ صاحب اخبار کے حوالے سے معمولی معمولی باتوں کا بھی زبردست نوٹس لیتے تھے۔ایک بار میں نے ایک نیوز سٹوری میں جگہ کا نام، جن شاہ مسجد رعناواری لکھا، تو خواجہ صاحب نے درست کرتے ہوئے کہا کہ یہ جن شاہ نہیں بلکہ زندہ شاہ مسجد ہے۔خواجہ صاحب چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھتے تھے۔

آفتاب میں کام کرنے کے دوران میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ آفتاب میں کوئی عنوان ہو یا کوئی بھی سرخی لکھی جاتی تو خواجہ صاحب اسے خود دیکھتے اور اس کی نوک پلک سنوارتے ۔یہی وجہ ہے کہ سرخیاں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں اور خواجہ صاحب کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے اس اخبار میں صحافت یا کتابت کے لحاظ سے غلطیاں نظر نہیں آتیں۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ آفتاب میں مختلف کالموں کے عنوانات بھی خود رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے۔انہوں نے مجھ سے ایک بار کہا کہ تم سرینگر کی ڈائری لکھا کرو۔ میں نے حامی بھرلی اور عنوان بتایا۔"سرینگر کا غیر سرکاری روزنامچہ" ساتھ ہی کہا کہ ڈائری تم لکھا کرو گے لیکن تحریر کرنے والے کا نام اس طرح سے لکھنا یعنی"راہ گیر کے قلم سے"۔

یہ کالم میں کئی برسوں تک لکھتا رہا۔راہ گیر کو پولیس کے علاوہ سماج میں غلط کاریاں کرنے والے اور سیاسی لیڈر بھی بڑا ڈھونڈتے رہتے تھے۔

خواجہ صاحب نے سماج کے مختلف مسائل کے حوالے سے ایک اور ہفتہ وار کالم لکھنے کے لئے مجھ سے کہا اور خواجہ صاحب نے میر قلمی نام یورش کشمیری رکھا۔اسی طرح ممتاز افسانہ نگار عمر مجید، ممتاز صحافی طاہر محی الدین، ممتاز صحافی یوسف جمیل، ممبر پارلیمنٹ غلام نبی رتن پوری"سون میراث" کی ایڈیٹر محمد یوسف مسکین وغیرہ کے بھی کئی فرضی نام تھے جن کے تحت وہ لکھا کرتے تھے۔

میرا یہ سب کچھ لکھنے کا بنیادی مقصد ہے کہ خواجہ صاحب اخبار کے اداریہ یا Lead سٹوری کی حد تک ہی آفتاب کے صفحوں کی نگرانی نہیں کرتے بلکہ ہر صفحے کی نوک پلک سنوارنے کا کام وہ کسی دوسرے کے حوالے نہیں کرتے۔سیاسی صورتحال کے نشیب وفراز کے سلسلے میں بھی آفتاب میں خواجہ صاحب کی ہدایت پر کئی سیاسی کالم چھپتے تھے جن میں سیاسی مباحثے ہوا کرتے تھے۔آفتاب کے روح رواں محمد صدیق"ذوالقرنین" کے قلم سے سیاسی تبصرے لکھتے تھے۔ریڈیو کشمیر سرینگر کے نیوز ریڈر اور معروف شاعر عبدالاحد فرہاد یونیورسٹی کی ڈائری"کوکب کشمیری" کے قلم سے تحریر کرتے تھے۔سابق ممبر پارلیمنٹ عبدالرشید کابلی (مدیر شہید اعظم ہفت روزہ) کربلی کے قلم سے لکھتے تھے۔ مرحوم غلام رسول سیاستدان بھی سیاسی کالم تحریر کرتے تھے جبکہ خواجہ محمد صدیق ایک کالم "حماقتیں" عقلمند کے قلم سے لکھتے رہے ہیں۔ان سبھی کالموں کے پیچھے خواجہ صاحب کی Direction ہوتی تھی۔ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ خواجہ صاحب آفتاب کے تین موضوعات کے خود Dictation دیتے تھے اور وہ کالم ہیں اداریہ، شاہ سرخی اور اس کا متن۔اس کے علاوہ خواجہ صاحب" خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" کا بھی Dictation دیتے تھے۔یہ Dictation خواجہ صاحب کرسی

پر بیٹھ کر نہیں بلکہ اپنے دفتر کے چھوٹے موٹے ہال میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگانے کے دوران دیا کرتے تھے۔ رات گئے تک کام کرنے اور تازہ بہ تازہ خبریں چھاپنے کے لئے خواجہ صاحب نے ہی دیگر اخبارات کو دیر تک کام کرنے کی طرح مائل کیا۔ آفتاب کی شاہ سرخی اور اس کے متن کا رات دس بجے سے پہلے تعین ہی نہیں ہوتا تھا اور کبھی کبھی میں نے یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ زمینی سطح پر وادی کی صورتحال میں کچھ خلفشار، ہنگامے، احتجاج یا پھر سیاسی اتار چڑھاؤ ہوتے، تو اس صورت میں کبھی کبھی رات کے بارہ بجے کلیدی سُرخی اور اس کے متن کا تعین ہوتا تھا اور اس طرح اخبار صاف ستھرے طریقے سے چھاپنے اور جدید تکنیک اپنانے کے لئے خواجہ صاحب ہی نے پہل کی اور پہلا آفیسٹ پرنٹنگ پریس سرینگر منگوایا اور روزنامہ آفتاب آفیسٹ پرنٹنگ میں پہلے اخبار کی حیثیت سے شامل ہوگیا۔ ہر ہفتے ضمیمہ شائع کرنا بھی خواجہ صاحب کے سر جاتا ہے۔ نظام الدین وفائی صاحب نے پریس کا کام سنبھالا۔ بعد میں دوسرے اخباروں نے بھی آفیسٹ کے حوالے سے آفتاب کی تقلید کی۔ آفتاب کے پہلے فوٹو جرنلسٹ محمد امین رہے ہیں جب کہ بعد میں ایس طارق نے کام سنبھالا۔

جہاں تک وادی میں اخبار بینی کا تعلق ہے اس کا سہرا بھی خواجہ صاحب کے سر کو جاتا ہے۔ انہوں نے آفتاب کو دن رات کی انتھک کوششوں اور محنت سے گھر گھر کا اخبار بنایا۔ کشمیر میں اخبار نہ پڑھنے کی عادت کی وجہ سے اخبارات کی سرکولیشن بڑی محدود تھی لیکن آفتاب نے انقلاب لایا۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ نے کشمیری عوام کے مزاج میں اخبار بینی شامل کردی۔ اس سے قبل کسی نے ایسی کوشش نہیں کی تھی۔ بعد میں یہ سلسلہ سری نگر ٹائمز کے مدیرِ اعلیٰ صوفی غلام محمد نے آگے بڑھایا۔ آفتاب نے نہ صرف صحافیوں کی بڑی کھیپ عوام کے سامنے رکھی بلکہ اردو ادب کے حوالے سے انہوں نے اخبار کے ذریعے کئی ادیبوں کو ابھرنے کا موقعہ دیا جن میں کئی ادیب بہت آگے بڑھے۔ آفتاب سے ہی ایم نساء، واجدہ تبسم (کشمیری)، نعیمہ احمد مہجور، رضیہ تبسم، رابعہ دلشاد، آفتاب کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل رہیں۔ مبین الخلیل، زینت آراء نیوز کاسٹر، کئی تصانیف کی خالق فریدہ ترنم، سلیمہ جان، رفعت آراء حیدری، سعیدہ اختر، ساجدہ بانو، رفعت آراء، اس کے علاوہ فاروق رینزو، بشیر گاش،

مولوی عبدالحی ،ڈاکٹر اے وحید، نذیر نذر، نذیر جہانگیر، یوسف جمیل ،عبدالمجید غافل، جاوید آزر، مشتاق مہدی، ڈاکٹر نذیر مشتاق، ڈرامہ نگار بشیر دادا، زاہد منظور، شبنم قیوم، رشید پروین، زاہد مختار، مقبول ویرے، نذیر احمد نظیر، اعجاز بانڈے، رفیق اشبری، خلیل محمد خلیل، عبدالاحد بٹ، عبدالواحد، نذیر احمد شیدائی، محبوب نوگامی، ظہور احمد ظہور، محمد مقبول شوق، ساجن منظور، الطاف ناؤپوری، جان محمد آزاد، عبدالرشید فراق، شیخ بشیر احمد، ایس ایم قمر، اسماعیل ذولفی، ابن صمد، مم صدیق، محمد یعقوب بافندہ، یاسین فردوسی، غلام نبی شاہد، یوسف سکندر وغیرہ، اور دیگر کئی قلمکاروں نے آفتاب سے شروعات کی۔

آفتاب میں کام کرنے والے کئی صحافی آج بین الاقوامی سطح پر اُفق کے تارے بنے ہوئے ہیں جن میں سرفہرست یوسف جمیل ہیں، جو نہ صرف ملکی سطح کے اخبارات بلکہ Time Magazine، نیویارک ٹائمز، وائس آف امریکہ اور دی نیشن کے ساتھ خصوصی نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ مرحوم اس وجہ سے انتظامیہ اور سیاسی ہنگاموں کے علاوہ وزراء کے درباروں سے بڑے عزت واحترام کے ساتھ بلائے جانے کے باوجود دور دور رہتے تھے کہ کہیں ان کے ساتھ نزدیکیوں سے وہ روزنامہ آفتاب کو ان کا آلۂ کار بنانے کے گناہ کا مرتکب نہ ہوں۔ یہ ایک بہت بڑی قربانی ہے۔

آج کی صحافت میں وزراء، بعض اخبارات کی نکتہ چینی پڑھ کر زیر لب ہنستے ہیں اور اخبار کو پھینک دیتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں وزراء اخبار میں چھپی نکتہ چینی پر خوف کھاتے تھے، توبہ کرتے تھے اور عوامی کاموں کو مکمل کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

خواجہ صاحب کو سمجھنے کی ایک اور گتھی میں کھول دینا چاہتا ہوں۔ کچھ برس قبل جب ایس کے آئی سی سی میں آفتاب کی گولڈن جبلی کی کلیدی تقریب ہو رہی تھی۔ ابھی خواجہ صاحب ڈائس پر اکیلے بیٹھے تھے اور ان کے مقابل میں پورے ہال میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بیٹھی ہوئی تھی جن میں وکلاء، ادباء، معزز شہری اور صحافی حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جوں ہی ہال کے اندر

داخل ہوا تو سیدھے خواجہ صاحب کے پاس چلا گیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن خواجہ صاحب نے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے اکثر لوگوں نے اس رویے کو مغروریت سے تعبیر کیا، لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ خواجہ صاحب نے مجھ سے دھیمے لہجے میں کہا "میں آپ کے ساتھ اس لئے مصافحہ نہیں کر رہا ہوں کیونکہ جو لوگ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں میں نے ان کے ساتھ مصافحہ نہیں کیا تو آپ کے ساتھ کیسے کروں"۔

لیکن اس بات کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں چلا، اس لئے انہوں نے فی سبیل اللہ خواجہ صاحب کو مغرور قرار دیا۔ بعد میں میں نے کئی لوگوں کو اصل واقعہ کے بارے میں آگاہ کیا۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اگر کسی کو خواجہ صاحب سنکی لگے ہوں۔ لیکن وہ ایسے نہیں تھے۔ بڑے رحمدل تھے۔ ان کے سینے میں کشمیریوں کے لئے دل دھڑکتا رہتا تھا۔

اب دیکھئے خواجہ صاحب کی شفقتیں۔ آفتاب کی گولڈن جبلی کے سلسلے میں نے دو شال خریدے۔ ایک ان کے لئے، ایک خواجہ محمد صدیق کے لئے۔ شال لے کر میں ایس کے آئی سی سی پہنچا تو سنا خواجہ صاحب نے تحفے تحائف لینے سے معذوری کی ظاہر کی ہے۔ میرے شال لانے کے بارے میں انہیں بتایا گیا تھا۔ گولڈن جوبلی کے بعد میں ان کے دفتر شال لے کر پہنچا۔ ملنے کی اجازت چاہی تو انہوں نے Message بھیجا مل سکتے ہو لیکن شال کے بغیر۔ میں ان سے ملا تو میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور میں نے ان سے کہا کہ آپ نے ہاتھ پکڑ پکڑ کر سکھایا ہے۔ میرا سب کچھ آفتاب کی بدولت ہی ہے۔ شال محبت سے لائی ہے۔ آپ نے منع کیا تو خواجہ صاحب مسکرائے، بولے شال کہاں ہے؟ میں نے کہا باہر منیجر کے کمرے میں رکھا ہے۔ وہ بولے لے آؤ۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوئے اور میں نے شال ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے شال کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا میں نے قبول کیا۔ اب یہ شال میں تمہیں اپنی طرف سے دیتا ہوں۔ میری آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔ یہ تھی خواجہ صاحب کی شفقتیں، جنہیں محسوس کرنے کی ضرورت تھی لیکن لوگ سطحی طور ان کے مزاج کے بارے میں غلط رائے قائم کر گئے۔

(بشکریہ: روزنامہ آفتاب)

..........●●●..........

☆...... ش۔م۔احمد

آفتاب اور عقل نُما

''آفتاب'' سلسلہ روز وشب کے حساب سے فی الحال پچاس سال اپنے پیچھے چھوڑ کر کشمیر میں گولڈن جوبلی منانے والا پہلا اخبار ہونے کا اعزاز حاصل کر گیا۔ پچاس سال تک مسلسل اخبار چلانا، اسکے تمام ناز نخرے برداشت کرنا، اسے وقت کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کرنا، وہ بھی ایک ایسی سرزمین میں جہاں موسموں کی طرح طبائع اور پسند وناپسند کے معیار بدل جانے میں دیر نہیں لگتی، جہاں مزاجوں کا ناقابل اعتبار تغیر وتبدل علم نفسیات کی سب سے بڑی ناقابل فہم گتھی بنی ہوئی ہے اور جہاں وفاداریاں اور دوستیاں میلی قمیض کی طرح تبدیل کی جاتی ہیں اور جس موٗقف یا نکتۂ نظر پر جان دینے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اُسی کو سرراہ رسوا بھی کیا جاتا ہے'' آفتاب'' نے اسی سرزمین میں گولڈن جوبلی کا ریکارڈ بنایا۔

ان پانچ دہائیوں کے دوران'' آفتاب'' نے پرورشِ لوح وقلم کرنے کے خوب جوہر دکھائے......خبروں کے بننے اور بگڑنے کا چرچا کیا، تبصروں کے طومار باندھے، اداریوں کی دماغ سوزیاں پیش کیں، طنز ومزاح کے قہقہے مارے، واقعات کا سینہ چیر کر حقائق کو بے حجاب کیا......یہی سب کچھ کرتے کرتے نصف صدی گزر گئی اور یہ سفراب بھی جاری وساری ہے۔

کوئی کارنامہ نہیں کہ اس روزنامے نے قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا بلکہ اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس کے توسط سے صحافیوں، قلمکاروں اور ادیبوں کی ایک اچھی خاصی تعداد بھی تیار کی۔ اس ناچیز کو بھی'' آفتاب'' کی خوشہ چینی اپنے ظرف کے مطابق کرنے کا شرف حاصل رہا، اپنے اس چھوٹے موٹے 'رشتے' کو شاید انشاؔ کا یہ شعر بہتر طور اظہار کی زُبان عطا کرتا ہے۔

اشک مژگانِ تر کی پونجی ہے

یہ شیشہ کی پونجی ہے

''آفتاب'' کے ساتھ میرا ''تعلق'' میرے بچپن میں یونہی شروع ہوا۔ یہ بے فکری اور معصومیت کے ان دنوں کی بات ہے جب میں ڈاؤن ٹاؤن کے ایک پرائمری سکول (جبری زٹ) میں چوتھی جماعت کا ''مظلوم'' طالب علم تھا۔ ہمارے سکول کا اردو ٹیچر اللہ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے...... بڑی بڑی خوفناک مونچھوں والے اور گرم مزاجی و ترش روئی میں اپنی مثال آپ سمجھے جانے والے گنائی صاحب تھے۔ ہم سر پھرے لڑکوں نے ان کا نام نامی پوشیدہ طور ''ظالم سر اور'' جابر خان'' رکھا تھا۔ وہ اردو زبان کے بڑے دلدادہ البتہ طبعاً سخت مزاج کے تھے۔ اوپر سے چاروں پہر اُن کے مضبوط و بے رحم ہاتھ میں موٹی سی چھڑی ہمیشہ رہتی تھی جسے وہ بڑے فخریہ انداز میں ''عقل نما'' کہتے تھے۔ اس ''عقل نما'' سے وہ بڑے بڑے معر کے سر کرنے کا ریکارڈ بنا چکے تھے۔ اُنہوں نے بشمول میرے چار لڑکوں پر یہ ''غیر نصابی اور ظالمانہ'' ذمہ داری عائد کر دی تھی کہ ہم اپنی اُردو املاء کاپی میں ہفتے میں دو بار اخبار ''آفتاب'' کی دو چار لائنیں (خبروں کی سرخیاں) لکھ کر لایا کریں۔ اس آمرانہ حکم کے سامنے ہم غریبوں کی کیا چلتی۔ اگرچہ ہمارے تنِ ناتواں پر یہ بوجھ پہاڑ سے بڑھ کر بوجھل اور وزنی تھا مگر ہم نے ''عقل نما'' کے خوف سے بلا چوں و چرا اثبات میں سر ہلا دیا کہ بروچشم اس حکم پر عمل درآمد کریں گے۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ ہمیں اخبار کے الف با سے بھی واقفیت نہیں تھی، اوپر سے یہ آفت بھی آڑے آرہی تھی کہ ہمارے گھروں میں اخبار خرید کر لانے کا رواج تو سرے سے موجود نہ تھا۔ ان مشکلوں کے باوجود گنائی صاحب کے حکم سے سرتابی یا سرمو انحراف کرنے کا کام مجرم بننا خود پر ''عقل نما'' کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ کشمیر ہمالیہ پہاڑ کی مانند کھڑا ہو گیا کہ اخبار آخر کہاں سے حاصل کیا جائے۔ لے دے کے ہماری نظریں زینہ کدل کے اس عمر رسیدہ اور پست قامت بک سیلر پر مرکوز ہو گئیں جس کا ناک نقشہ ہم جیسے معصوم بچوں کو ''پاسنگ در'' سے مشابہ محسوس ہوتا تھا۔ جب ہم نے سنا کہ وہ ''آفتاب'' کو خرید کر لاتا ہے تو ہماری جان میں جان آ گئی۔ یہ بک سیلر اُن دِنوں ڈاؤن ٹاؤن کے تمام بچوں میں ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اس کی عادت تھی کہ جب تک فالتو وقت میں اخبار کا لفظ لفظ اور سطر سطر نہ پڑھتا اسے ہاتھ چھوڑنے کا نام ہی نہ لیتا۔ بہر حال جب ہم چاروں اُس کے

حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے اور مودبانہ انداز میں قلم، کاپی، دوات یا کتاب پنسل کے بجائے مفت میں اخبار ہمارے حوالے کرنے کی گداگرانہ التجا کی تو اُس ''پاسنگ در'' کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور آگ بگولہ ہو کر مکھیوں کی طرح ہمیں دکان سے جھاڑنے لگا۔ نہ جانے ہم ناتواں بچوں میں کہاں سے یہ ہمت آگئی کہ اس کی ناں ناں کے باوجود اس کا ذرا بھر بھی پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ بات صاف تھی کہ اگر ہم وہاں سے اپنی ''عزتِ نفس'' بچانے کے لئے بھاگ بھی جاتے تو ''عقل نما'' ہمارے پیچھے پڑ جاتا۔ اس لئے جہاں ہم میں بھاگنے کی گوں نہ تھی۔ وہاں اقامت کی تاب لانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یکایک ہمارے ایک ساتھی کے آنسو بہہ نکلے اور آواز بھی گلوگیر ہو گئی۔ اس نے ''پاسنگ در'' سے صاف صاف کہا اگر آپ نے ''آفتاب'' نہ دیا تو ہم سب مر جائیں گے بلکہ بے دردی سے مارے جائیں گے۔ ہم نے گنائی صاحب اور ان کے ''عقل نما'' کا ذکرِ خیر بھی چھیڑا۔ آنسوؤں سے بک سیلر کا دل پسیج گیا اور مجھے یاد ہے کہ کافی بُرا بھلا کہہ دینے کے بعد اُس نے ''آفتاب'' کا تازہ پرچہ ہمارے کشکول میں ڈالا اور پھر ہم مکھیاں وہاں سے ہٹ گئیں۔ گھر میں اس اخبار کی دو چار لائنیں کاپی پر اُتار کر ہم نے خیر سے یہ پہلا میدان مار لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ کن سرخیوں کو ہم نے کاپی کی زینت بنالیا البتہ اتنا میرے حافظے میں اب بھی تر و تازہ ہے کہ جب ہم نے گنائی صاحب کے سامنے فاتحانہ انداز میں کاپیاں چیک کرانے کے لئے پیش کیں تو اُن سے شاباشی کی گو کوئی اُمید نہ تھی مگر ہمارے جسم تھر تھر کانپ رہے تھے کہ کہیں کوئی غلطی نہ وہ نکالیں اور ہماری بے رحم مار پیٹ کا بہانہ اُن کے ہاتھ لگے۔ اُنہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ اپنے خشک :ونٹوں پر پھیلا دی اور ''ظالمانہ غرور'' کے ساتھ صرف اتنا کہا: ٹھیک ہے، اب آگے سے پانچ لائنیں لکھ کر لاؤ۔ اُس وقت بھلے ہی ہمارے جانوں میں جان آگئی مگر یہ پانچ لائنوں کا معاملہ اتنا سخت ٹارگٹ تھا جتنا کسی بے نمازی پر پانچ وقت کی نماز با جماعت پڑھنے کا جبر ہو سکتا ہے۔ حکم حاکم مرگِ مفاجات، ہم نے بھی بغیر سوچے سمجھے ہوں ہاں میں حامی بھر لی۔ زینہ کدل کا بک سیلر ہمارے لئے ''آفتاب'' کی روشنی اور امید کی کرن تھی مگر شومئی قسمت سے وہ ہم انوکھے بھمک منگوں کو تاریکی اور سورج گرہن کی علامتیں سمجھتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر نہ معلوم اُس میں گنائی صاحب کی روح

کیسے حلول ہوتی تھی کہ وہ کہاسنی کے بغیر ہم ہی پر برس پڑتا۔ مگر ہم بھی کہاں ہار ماننے والے تھے۔ اُس نے تنگ آکر معمول کے مطابق ایک بار پاس ہی کھڑے پولیس والے کو آواز دے کر پکارا اور کہا کہ ان بھکاریوں کو پولیس حوالات میں بند کر کے میری جان چھڑاؤ۔ پولیس کے اہلکار کی نظر عنایت پڑنے سے پہلے ہم وہاں سے دُم دبا کر بھاگ گئے لیکن دو چار لمحوں کے بعد پھر وہاں پہنچ گئے۔ ہم سے عاجز آکر بک سیلر نے ہتھیار ڈال دیئے اور ''آفتاب'' کے پرچے کو یہ کہہ کر تھما دیا: خدارا آئندہ پھر کبھی اپنا منحوس منہ نہ دکھانا۔ اخبار حاصل کرنے کے بعد ہم پھر اُس کے پاس یہی مطالبہ کر جاتے اور وہاں ایک ہی قسم کے کھیل تماشے سے ہمارے پالا پڑتا۔ اگر چہ بالآخر جیت ہمارے تقدیر میں لکھی ہوتی کیونکہ یہ عزت کا نہیں بلکہ ''عقل نما'' کی مرمت سے بچنے کا سوال تھا۔ تاہم اخبار کے ہر شمارے کو دوسرے روز واپس لوٹانے میں ہم حد سے زیادہ دیانتدار ثابت ہوتے رہتے۔

ایک دن سوئے اتفاق سے بک سیلر کی دکان کسی وجہ سے بند تھی۔ جب دکان کو بند پایا تو ہم چاروں بے جان ہو گئے کہ اب کیا کیا جائے، ''پاسنگ در'' کو اندر ہی اندر صلواتیں سنانے کے بعد ہم نے فیصلہ لیا کہ ہم اُس کے گھر جا کر ''آفتاب'' کو حاصل کریں گے۔ لیکن اف! ہماری بدقسمتی کسی نے اس کا اتہ پتہ نہ بتایا۔ ہماری بے یار و مددگار کیبنٹ کے سامنے اس مصیبت کا ازالہ کرنے کے لئے اب دو ہی راستے بچتے تھے۔ اوّل یہ کہ جہلم میں کود کر خود کشی کی جائے، دوم یہ کہ بیماری کا بہانہ بنا کر سکول سے چھٹی کی جائے۔ دونوں راستوں میں اپنے Merits اور Demerits تھے۔ اب تھرڈ آپشن پر بات ہونے لگی کہ چلو گھر سے کتابوں کا بستہ لے کر سکول جانے کو نکلتے ہیں مگر پورا دن خانقاہ معلیٰ، دستگیر صاحب، بادام واری میں موج مستی میں گزارا جائے۔ اس آپشن پر گو ہمارے درمیان اتفاق ہوا لیکن دفعتاً عقل کا آفتاب طلوع ہو گیا کہ ہم میں سے گنائی صاحب چونکہ ایک لڑکے کے قریبی رشتہ دار ہیں، اگر انہوں نے بدقسمتی سے اس لڑکے کی سکول سے غیر حاضری کی وجہ اس کے ابا چاچا سے دریافت کی تو ہمارا بانڈا سر راہ پھوٹ جائے گا۔ لہٰذا سکول سے بھاگنے کے اس اوچھے خیال کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور ہم دھڑام سے نیچے آگرے۔ چونکہ ان دنوں ٹیچر صرف تنخواہوں کے پیچھے مر مٹنے والے نہ ہوتے تھے بلکہ ہر طالب علم کو اپنی ہی اولاد سمجھتے تھے۔ اس لئے

طالب علم کے بارے میں ہمیشہ متفکر رہتے تھے۔ یوں اگر سکول سے بھاگنے کا راز گنائی صاحب پر کھل جاتا تو وہ سیدھے ہمیں پھانسی کی سزا دیتے۔ اب صرف بیماری کی تجویز پر اتفاق ہوا۔ اس پر عملدر آمد کرانے کا فیصلہ اس چار نفری کمیٹی نے اتفاق رائے سے لیا۔ بد قسمتی سے میرے گھر والوں کو میرے بیماری کے بہانے پر شک گزرا اور بڑے بھائی صاحب نے میرے بہتے آنسوؤں کے احتجاج کے باوجود جبراً مجھے سکول میں لا کھڑا کیا۔ وہاں گنائی صاحب نے فوراً اپنی عدالت کا ایوان بٹھایا۔ اس عدالت میں ''عقل نما'' کی موجودگی میں حلف لینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں نے ''عقل نما'' کی شکل دیکھتے ہی اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی موسلا دھار بارش کو فوراً اپنے گالوں کے فرش پر گرایا اور صاف صاف کہا کہ ''پاسنگ در'' اس سارے فتنے کی جڑ ہے۔ اگر وہ دکان بند نہ کرتا تو ہم ''آفتاب'' کی شعاعیں لے کر سکول میں حاضر ہوتے اور معاملہ بہانہ بازی کا رُخ اختیار نہ کر لیتا۔ صاف گوئی سے اس ''ظالم خان'' کا پارہ مزید چڑھ گیا لیکن شک کا فائدہ دیتے ہوئے ''عقل نما'' کو سزا دینے کی زحمت نہ دی بلکہ کان پکڑی، کرا کر میرا کچومر نکالا۔ اس سزا کو تقریباً دس پندرہ منٹ بھگتنے کے بعد رہائی ملی لیکن شاید شرمندگی کے احساس سے گنائی صاحب نے اپنے ہینڈ بیگ سے ''آفتاب'' کا تازہ شمارہ نکالا اور میرے حوالے کرتے ہوئے کہا اب آگے کتب فروش کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ تم چاروں سیدھے میرے پاس ہفتے میں چار بار اپنی اپنی باری پر اخبار لیا کرو اور مارننگ پیریڈ میں اس کی خبروں کو سنانے کی اضافی ذمہ داری بھی تم پر عائد رہے گی۔ ساتھ ہی اُردو کاپی میں پورا صفحہ اس کی لائنوں سے بھرنا ہوگا۔ یہ اس مسئلہ کشمیر کا ''آبرومندانہ اور منصفانہ'' حل تھا جس پر ایک سال تک ہم خوشی خوشی عمل پیرا رہے۔ ہم میں سے روز کوئی نہ کوئی لڑکا آفتاب کی سرخیاں مارننگ پیریڈ کے فوراً بعد پڑھنے لگا تو ایک معاملہ یہ پیش آیا کہ جہاں خواندگی میں غلطی ہوتی وہاں گنائی صاحب کا ''عقل نما'' ہماری صحتِ زبان کو درست رکھنے کیلئے کبھی کبھی حرکت میں آتا اور سرِ راہ ہماری رسوائی اور جگ ہنسائی کا باعث بنتا۔ اتنا ہی نہیں ہم چاروں لڑکوں کے ناموں کے ساتھ اب ''آختاب'' کا نام بھی جڑ گیا۔ بچے ہمیں چڑانے کے لئے اسی نام سے پکارنے لگے۔ میں مختار آختاب نما'' دوسرا لڑکا افضل آختاب، تیسرا لڑکا منظور آختاب اور چوتھا لڑکا شکور آختاب کے نام

سے مشہور ہو گئے۔اس زمانے کا کوئی قریبی کلاس میٹ اگر اب بھی ملتا ہے تو مختار آفتاب کے نام سے پکارنا بھول نہیں جاتا۔واللہ اعلم افضل، منظور اور شکور کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہوتا ہے یا نہیں۔

افسوس! کہ آج گرم مزاج گنائی صاحب بقیدِ حیات نہیں۔وہ ہوتے تو اللہ گواہ اپنے من پسند اخبار ''آفتاب'' کی گولڈن جوبلی پر شاید اور لوگوں سے زیادہ خوشیاں مناتے لیکن آہ! جب اُردو زبان کی خستہ حالی اور اس کی غریب الوطنی کا یہ حال دیکھتے جو اس وقت اس کا مقدر بنا ہوا ہے تو وہ ''عقل نما'' کا بے دریغ استعمال کرنے میں شاید ہی کسی پس و پیش سے کام لیتے۔بد قسمتی سے اب ہمارے یہاں اُن کا جیسا کوئی مخلص، بے لوث اور محبِ اردو ٹیچر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔اگر آج کے ماڈرن ٹیچر بچوں کو ''عقل نما'' کے بجائے پیار و محبت سے کام لینے کی ''فلسفیانہ باتوں'' کو تعلیم کا گناہ مانتے ہیں لیکن آج مجھے گنائی صاحب کی اس مار میں زندگی کے تمام فلسفوں کا زیورِ حسن دکھائی دیتا ہے جو انسانوں کو حقیقی انسان بنانے کے لئے معرضِ وجود میں لائے گئے۔''آفتاب'' کو بے شک اپنی گولڈن جوبلی پر ڈھیر ساری خوشیاں منانے کا حق بنتا ہے لیکن ہماری اجتماعی بے توجہی اور بے حسی سے اُردو زبان کا مستقبل جو بڑی تیزی کے ساتھ تاریک تر ہو رہا ہے اُس پر جتنا رویا جائے بہت کم ہے۔ کیونکہ اگر اردو زبان کا یہی حال رہا تو شاید ''آفتاب'' اس زبان کا پہلا اور آخری اخبار ہوگا جسے یہاں گولڈن جوبلی منانے کا موقعہ مل گیا۔ایسے میں ہمیں گنائی صاحب کے جیسے دردِ دل رکھنے والے معلم اور ''عقل نما'' جیسے نصاب کی پھر سے ضرورت ہے۔''آفتاب'' اور ''عقل نما'' کے اٹوٹ رشتے سے قطع نظر آج گنائی صاحب کو یاد کرتے ہوئے میرے وردِ زبان پر اشعار ضرور ہوتے ہیں۔

آفاق ہا گر دیدہ ام   مہر بُتاں وز دیدہ ام
بسیار خُوباں دیدہ ام   لیکن تو چیزے دیگری

(بشکریہ: کشمیر عظمیٰ جلد:۴، شمارہ نمبر:۳۰)



☆...... ڈاکٹر جوہرؔ قدوسی

اُردو زبان وادب کے فروغ میں روزنامہ ''آفتاب'' کا حصّہ

کشمیر میں اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور فروغ وارتقاء میں صحافت نے ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک کشمیر میں صحافت کا دوسرا نام اُردو صحافت ہی مُراد لیا جاتا تھا لیکن اب چونکہ سرینگر سے ایک درجن سے زائد انگریزی روزنامے منظرِ عام پر آتے ہیں، اِس لئے یہاں کی صحافت کو اُردو صحافت کہنا اب برمحل نہیں ہے۔ تاہم ابتداء سے لے کر آج تک اُردو صحافت نے کشمیر میں اُردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور فروغ وارتقاء میں جو حصہّ ادا کیا ہے، وہ اپنی ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

''آفتاب'' کشمیر کی اُردو صحافت میں ایک اہم ترین سنگِ میل بلکہ اہم ترین ستون کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اِس کے بانی مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب کو جو لوگ کشمیر میں بابائے صحافت قرار دیتے ہیں، وہ بلاشک وشبہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں کرتے۔ خواجہ صاحب نے صحافت کا چراغ اُس زمانے میں جلایا، جب اِس شعبے میں ظلمت وتاریکی کی تیز وتند ہوائیں چل رہی تھیں۔ بقول کسے۔

ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہیں بساطیں اکثر

''آفتاب'' کے اُس تاریخی رول کی وضاحت کا حق ادا کرنا نہایت مشکل ہے، جو اِس اخبار نے کشمیر میں صحافت اور بالخصوص اُردو صحافت کے فروغ کے لئے ادا کیا۔ بلاشبہ اِس اخبار کو یہاں کی اُردو صحافت میں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

آفتاب جون ۱۹۵۷ء میں ہفت روزہ کی شکل میں اپنی اشاعت کا آغاز کرنے کے چھ مہینے بعد ہی یکم جنوری ۱۹۵۷ء سے روزانہ شائع ہونے لگا۔ ترقی واستحکام کے اِس تیز ترین عمل کے پس پردہ جو عوامل کارفرما تھے، اُن میں ''ثناء اللہ بٹ'' پہلے اخبار نویس ہیں، جنہوں نے اس زمانے میں اخبار کو عوام کا اخبار بنانے کی کوشش کی۔ اب تک کوئی اخبار نویس اخباروں کی اشاعت بڑھانے کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتا تھا۔ ثناء اللہ بٹ نے اس رجحان کو ختم کر دیا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ اخبار، اخبار کہلانے کا مستحق نہیں، جو عوام کے سامنے نہ آئے ...... وہ اخبار نویسی میں نئے تجربے کرنے لگے۔ انہوں نے کچھ روایتیں قائم کیں۔

کشمیر میں روزانہ اخبارات کی قدر و قیمت، جو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی، ''آفتاب'' کی اشاعت سے پھر بڑھنے لگی۔ ''آفتاب'' نے خبروں کی پیشکش اور وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر بے لاگ تبصروں کا جو انداز اختیار کیا، اُس نے بڑے بڑوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رکھا۔ ''آفتاب'' کی اس نئی روایت کی گونج سرکاری ایوانوں تک پہنچ گئی، یہاں تک کہ وزیرِاعظم بخشی غلام محمد بھی ''آفتاب'' کے انوکھے انداز سے متاثر ہو کر بقول رشید تاثیر ''اپنی

''پریس کانفرنسوں اور سرکاری تقاریب میں اس کی خبروں کا حوالہ دینے لگے، جس سے اس اخبار کی اہمیت ومقبولیت کو چار چاند لگ گئے''۔

کشمیر کی اردو صحافت میں ''آفتاب'' نے جو نیا انداز اختیار کیا اور مقبولیت کے مراحل جس تیزی سے طے کر لئے، اُس سے اردو زبان وادب کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ مختلف سلگتے مسائل و موضوعات پر اُردو کے اچھے قلمکاروں کی تخلیقات اور تبصرے اس میں شائع ہونے لگے اور اردو نظم ونثر لکھنے والے بہت سے نوجوان اہلِ قلم ''آفتاب'' کے حلقۂ ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''آفتاب'' اردو زبان وادب کی خدمت انجام دینے والا ایک ایسا ادارہ بن گیا، جس

سے وابستہ قلمکاروں کا اپنے عام قارئین کے ساتھ گہرا رشتہ قائم ہوگیا۔شاید اسی اہمیت کے پیشِ نظر محمد یوسف ٹینگ یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے :

''آفتاب نے کشمیر کی صحافت کو بہت سے نئے سنگ میل طے کرائے، اتنے بڑے سائز اور حجم میں اپنے نستعلیق، خوش خط اور صاف وشفاف گیٹ اپ میں شائع ہونے والا یہ پہلا کشمیری روزنامہ ہے اور اپنی طباعت اور کتابت کے لحاظ سے یہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان کے بہترین اردو روزناموں میں شمار کیا جاتا ہے، جو ہر صبح ایک نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ ہوکر سری نگر کے قارئین کو اپنی صباحت سے محظوظ کرتا ہے۔اس نے کشمیر کی صحافت میں سب سے پہلے آفسیٹ کی نئی ٹیکنالوجی استعمال کی اور اس کو ایک عظیم انقلاب سے آشنا کردیا، اس مرحلے پر بزاز کا ''ہمدرد'' کہیں اور غبارِ راہ میں گم ہوجاتا ہے۔''آفتاب'' کی کچھ خبریں اور انکشافات برصغیر ہی نہیں، عالمی پیمانے کے سکوپ بن گئے۔اس کے کالم ''پھول اور کانٹے'' میں صحافتی مزاح کے اچھے نمونے پیش ہوئے کبھی کبھار اس میں ادبی اور تحقیقی مضامین اُس پایئے کے شائع ہوئے کہ انہیں کشمیر کے کسی علمی تذکرے اور تبصرے میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، اس کا معرکتہ الآراء کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کرچکا ہے''۔[1]

ادارتی صفحہ :۔ ایک روزنامے میں دو صفحات خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ صفحہ اوّل (Front Page) جس کی اہمیت خبروں کی بنا پر ہوتی ہے اور ادارتی صفحہ (Editorial Page) جسکی اہمیت اداریہ اور اہم مسائل پر فکر انگیز اور سنجیدہ قسم کے تجزیاتی مباحث کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ''آفتاب'' نے شروع سے ہی اپنے ادارتی صفحہ پر اداریہ کے دو کالموں کے بائیں طرف مضامین کا جو سلسلہ شروع کیا، وہ کئی لحاظ سے اپنی اہمیت (استثنٰی کے ساتھ) آج بھی منوا رہا ہے۔اس سلسلہ مضامین میں لکھنے والے کے لئے نہ تو موضوعات کی کوئی قید رکھی گئی اور نہ ہی حجم کی۔ سیاسی، معاشی، سماجی، تہذیبی، ادبی، ثقافتی، مذہبی، معاشرتی، لسانی، ادبی، سائنسی۔ غرض ہر قسم کے موضوعات پر مختلف اصحابِ فکر کے رشحاتِ فکر لوگوں کے سامنے آتے رہے۔ مثلاً بہر

[1]۔ مضمون ''کشمیر کی صحافت کا آفتاب''۔ روزنامہ ''آفتاب'' (۱۲ر مئی ۱۹۸۱ء)

اپریل ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں اس جگہ یوسف جمیل کا تحریر کردہ ایک مضمون بعنوان ''عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کی اہمیت اور حکومت کے حالیہ فیصلے'' شائع ہوا ہے، جس میں اردو زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا گیا ہے کہ وہ اردو کی درس وتدریس کو محدود کرنے کا اپنا فیصلہ واپس لیں۔ مضمون کی زبان سلیس ہے اور بیان میں استدلال بھی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ریاستی حکومت کے ایک حالیہ فیصلے کے مطابق جموں وکشمیر کے تعلیمی اداروں میں اردو، عربی اور فارسی جیسی مشرقی زبانوں کی درس وتدریس محدود اور ممنوع قرار دی گئی ہے۔ کشمیر کی تاریخ، ثقافت اور اس کی تہذیبی روایات کی روشنی میں حکومت کا یہ فیصلہ یقیناً ایک غیر منصفانہ اور ناعاقبت اندیشانہ فیصلہ ہے۔ اردو کشمیر میں لوگ سب سے زیادہ لکھ، پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تقریباً نصف صدی سے آئینی لحاظ سے ہماری سرکاری زبان ہے، یہاں اخبارات وجرائد اور اکثر کتابیں اسی زبان میں شائع ہوتی ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت اس شیریں اور کئی لحاظ سے اہم زبان کی اہمیت کو کیوں کم کرنا چاہتی ہے۔ آج بھارت میں اردو کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کشمیر کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ اردو یہاں سرکاری زبان ہے لیکن یہ سمجھنا کہ یہ کشمیریوں پر کوئی احسان ہے، صحیح نہیں ہے۔ اب ایسا لگ رہا ہے کہ ہمارے حکمران واقعی اسے یہاں کے عوام پر ایک احسان سمجھنے لگے ہیں اور اس احسان کو واپس لینے کے لئے راہ ہموار کی جارہی ہے۔''

کشمیر کے بعض اخبارات کی غلط روش پر سرزنش کرتے ہوئے محمد یعقوب بافندہ نے ۳؍مئی ۱۹۷۰ء کے شمارے کے انہی کالموں میں اپنے ایک مضمون ''اخبارات کا اہم رول'' میں لکھا ہے:

''یہاں کے بعض اخبارات ایسے ہیں جو صرف سنسنی خیز خبریں چھاپتے ہیں اور عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ ان کی خبریں سچی ہوں یا جھوٹی ان میں سنسنی خیزی اتنی ہوتی ہے کہ لوگ پڑھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس طرح قتل وغارت، خون، طلاق اور اغواً کی وہ خبریں نوجوانوں کے پاس آتی رہتی ہیں۔ جن خبروں کی ضرورت

اخباروں کو نہیں، اس طرح سماج میں یہ لوگ نئی نئی بیماریاں پھیلاتے ہیں''۔

ادارتی صفحہ کے انہی کالموں میں ''عورت، تعمیری شاعری کے آئینے میں (رشید احمد رشید ۷ رفروری ۱۹۸۵ء) اور کشمیر زبان کا استعمال اور استحصال'' (پطرس کاشمیری ۱۶رفروری ۱۹۸۵ء) جیسے عام قارئین کے لئے کم دلچسپ مضامین بھی شائع ہوتے رہے اور تحقیق و تجسس اور شعرو ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین ''آفتاب'' کے لئے درج ذیل قسم کے قابل قدر تحقیقی وادبی مضامین بھی منظر عام پر آتے رہے، جن کی ادبی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا:۔

☆......عہد حافظ کی ادبی روایتیں از رضیہ سلطانہ مفتی سرینگر (اشاعت ۷رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......ڈرامے کی ادبی اور فنی قدریں۔از وقار عظیم (۸رفروری ۱۹۶۰ء)

☆......اردو ادب میں ترقی پسند تحریک۔از مولوی عبدالحی (۳۱رمئی ۱۹۷۰ء)

☆...... خاندان اقبال کی اصلیت ایک حیرت انگیز انکشاف۔از ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری (۱۹راپریل ۱۹۸۱ء)

☆......اقبال اور عطیہ فیضی بیگم از ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری (۳رمئی ۱۹۸۱ء)

یہ بات یہاں پر قابل ذکر ہے کہ موخرالذکر دو تحقیقی مقالوں میں ڈاکٹر حیدری نے بعض ایسے انکشافات کئے جو محققین اقبال کے لئے نئے بھی تھے اور دلچسپ بھی اور جن کا حوالہ بعد میں کئی محققوں نے اپنی تحریروں میں دیا۔

لیکن ''آفتاب'' کے ادارتی صفحہ کی اِس روشن تصویر کا ایک تاریک پہلو بھی ہے، جو ایک افسوسناک حقیقت کی صورت میں سنجیدہ قارئین کا منہ چڑاتا ہے۔رنگارنگ موضوعات پر قابلِ قدر مضامین شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ''آفتاب'' نے بعض اوقات انہیں کالموں میں غیر سنجیدہ قسم کے کچھ ایسے مضامین بھی منظر عام پر لائے جو کسی بھی طرح اس لائق نہ تھے، کہ اُنہیں ادارتی صفحہ جیسی متانت طلب جگہ پر شائع کیا جاتا۔مثلاً مندرجہ ذیل سنسنی خیز عنوانات کے تحت شائع ہونے والے غیر سنجیدہ قسم کے مضامین:۔

☆......شہزادہ، جو حسین لڑکیوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا (اشاعت ۲۱رجون ۱۹۶۰ء)

☆......یورپ جہاں ہر سال ۶۰ ہزار لڑکیاں اغوا ہوتی ہیں۔ ۲۳؍ جون ۱۹۶۰ء)

☆......تین ہفتہ تک قبر میں ایک عورت زندہ رہی (۲۹؍ جون ۱۹۶۰ء)

☆......عورت کا جذبۂ انتقام۔ قتل کی ایک لرزہ خیز داستان (۲۷؍ اگست ۱۹۶۰ء)

اِسی اہم (ادارتی) صفحہ پر ''آفتاب'' کے ادارتی کالموں میں جو اداریے (Editorials) شائع ہوتے رہے، وہ بھی اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ایک تو ان اداریوں کے مطالعہ سے ایسے مختلف حالات وواقعات کا علم ہوجاتا ہے، جن کو بنیاد بنا کر یہ لکھے گئے ہیں۔ اور دوسرے مختلف ادوار میں استعمال ہونے والی ''آفتاب'' کی ادارتی زبان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ۱۷؍ مارچ ۱۹۶۰ء کے شمارے میں ''پولیس کی ناکامی'' کے زیرِ عنوان جو اداریہ شاملِ اشاعت ہے، اُس کا ایک اقتباس یوں :۔

''سرینگر اور وادی کے دوسرے مقامات پر گزشتہ کچھ عرصے کے دوران جرائم کی جو وارداتیں ہوئی ہیں، پولیس ان میں سے اکثر و بیشتر وارداتوں کا سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے۔ ان وارداتوں کا سراغ لگانے میں پولیس کی ناکامی کی یہ وجہ نہیں کہ پولیس نے سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی یا اس سلسلہ میں کوئی غفلت یا بدعنوانی کی گئی ہے بلکہ ہماری اطلاعات کے مطابق پولیس نے معاملہ کی نہایت جانفشانی سے تفتیش کی لیکن اس کے باوجود پولیس اپنے مقصد میں ناکام رہی اور پولیس کو اپنی ناکامی پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔ ہمارے خیال کے مطابق پولیس کی اِس ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جرائم کی وارداتوں کا سراغ لگانے کیلئے ریاستی پولیس میں تربیت یافتہ لوگوں کا تقریباً فقدان ہے''۔

اس اقتباس میں اداریہ نگار نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اخبار کی زبان تو ہوسکتی ہے، لیکن اخبار کے اداریہ کی زبان ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اداریہ اخبار کی جان اور روح ہوتا ہے اور جب روح ہی لفظوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جائے تو جسم کی حالت قابلِ رحم ہونا یقینی ہے۔ اداریہ کے اس مختصر سے اقتباس میں ''پولیس واردات، سراغ لگانے، جرائم اور ناکامی'' جیسے الفاظ گنئے اور دیکھئے باقی کتنے الفاظ رہ جاتے ہیں؟ اس کے برعکس ۱۹۷۲ء میں

اداریہ نگار کی زبان نسبتاً نکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اِسی اخبار کے ایک اداریہ کا اقتباس، جس کا عنوان ہے: ''سمجھوتے کا ڈرامائی اعلان'':۔

''ہندوستان اور پاکستان میں سربراہوں کی بات چیت کے خاتمہ پر جس ڈرامائی سمجھوتہ کا اعلان ہوا ہے، اس میں دونوں ملکوں کے درمیان بعض اہم امور طے پا گئے ہیں۔ واقعات کے جس پسِ منظر میں سمجھوتہ ہوا ہے، اسے توقعات سے کہیں زیادہ کامیابی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور اسے دونوں ملکوں کے لئے ایک نیک شگون اور برصغیر کے مستقبل کے لئے ایک اچھی علامت تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ دونوں ملکوں نے پہلی مرتبہ آپس میں یہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کریں گے۔ اسے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات کی بحالی، باہمی تجارت، آمدورفت اور مواصلات کے دوبارہ قیام کیلئے سہولیتیں فراہم کرنا بھی طے ہوا ہے۔ ان تمام باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۵ سال کی مسلسل کشیدگی کا خاتمہ ہورہا ہے اور دوستی اور خیر سگالی کا ایک نیا دور شروع ہونے کی اُمید پیدا ہورہی ہے۔ ٹھیک ہے کہ کشمیر پر اس ملاقات میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوسکا اور نہ ہی جنگی قیدیوں کی واپسی پر کوئی اتفاق رائے ہوسکا ہے اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ پہلی ہی ملاقات میں تو سب کچھ طے نہیں ہوسکتا تھا۔ البتہ جس انداز سے مسائل حل کرنے کی بنیاد اور اشتراک و تعاون کی ایک نئی تحریک پیدا ہوئی ہے، وہ روشنی کی ایک علامت ہے۔ اس طرح شملہ کانفرنس نہ صرف اس برصغیر بلکہ پورے ایشیاء کی رہنمائی کا ایک ذریعہ بن گئی ہے'' [۱]

خود ''آفتاب'' کا اداریہ نگار اپنے اخبار کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اداریہ (بعنوان ''آفتاب'' ۲۹ ویں برس میں) سے ہوجاتا ہے۔ اداریہ نگار رقمطراز ہے:۔

''آفتاب'' آج اپنی زندگی کے ۲۹ ویں برس میں داخل ہورہا ہے۔ کسی سیاسی یا سماجی تنظیم

۱: روزنامہ ''آفتاب'' ۴؍ جولائی ۱۹۷۲ء

اور کسی سرمایہ دار طبقے یا گروہ یا کسی مخصوص حلقے کی سرپرستی اور اعانت کے بغیر اور اقتصادی اور مالی امداد اور مشکلات سے بے نیاز محض اپنے عوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ایک روزنامے کا اس خطے میں مسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ ۲۸ برس شائع ہونا بجائے خود کشمیر کی صحافتی تاریخ میں ایک منفرد واقعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اس سارے دَور میں کشمیر سیاسی اتھل پتھل، ہنگامہ آرائیوں اور انقلابات کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس قسم کی ہنگامہ خیز صورتحال میں "آفتاب" نے صحافت کے اعلیٰ مقاصد، خدمت کا جذبہ اور اپنی آزادانہ روش کو حتی المقدور برقرار رکھا۔ اہم سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے اگرچہ بارہا تند ہوائیں چلیں، صرصر چلتی رہی اور طوفان آئے، اقتصادی مشکلات نے اسے کئی بار کڑی آزمائشوں میں ڈالا، بقا اور فنا کے کئی مرحلے آئے لیکن یہ کشمیری عوام کا خلوص، "آفتاب" پر ان کا بے پناہ اعتماد اور اس اخبار سے ان کا لگاؤ ہی تھا، جس نے اسے حوصلہ بخشا اور وہی اس کی زیست کا سامان فراہم کرتے رہے"۔ [۱]

ادبی ایڈیشن:۔ "آفتاب" کافی عرصے تک (وقفوں کے ساتھ) اتوار کی اشاعت میں "ادبی ایڈیشن" شائع کرتا رہا۔ اس ایڈیشن میں ریاست اور خصوصاً وادی کے نوجوان ادباء اور شعراء اپنی تخلیقات منظرِ عام پر لاتے رہے "آفتاب" کی پرانی فائلیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وادی کے بہت سے نئے (اب معروف) افسانہ نگار اور شاعر اپنے ابتدائی زمانے میں "آفتاب" میں چھپتے رہے ہیں "آفتاب" کو یہ کریڈٹ دینے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ "ادبی ایڈیشن" کے علاوہ اپنے معمول کے شماروں میں بھی اِس اخبار نے جس طرح بیک وقت کئی کئی کہانیاں، افسانے اور ادبی خاکے شائع کئے، اُس سے اخبار کے عام قارئین کی اردو شعر و ادب تک رسائی آسان ہوگئی۔ مثال کے طور پر "آفتاب" کے یکم جولائی ۱۹۷۲ء کے عام شمارے میں تین افسانے (انجانی خوشبو۔ از نذیر احمد خان، شورہ گری محلہ سرینگر، اجالوں کی صلیب از۔م۔م۔ صدیق۔ سونہ وار سرینگر = دائرے۔ از شیخ بشیر احمد نواب بازار سرینگر) اور ایک مزاحیہ تحریر (کاش میں بھی ایک ایم ایل اے ہوتا۔ از

۱:۔ "آفتاب" یکم جنوری ۱۹۸۵ء

سید محمد رضوی ۔ دلنہ بارہمولہ شاملِ اشاعت ہیں۔ دیگر عام شماروں میں جو افسانے اور کہانیاں شائع ہوئیں، اُن میں چند ایک کی تفصیل بطور نمونہ یوں ہے:۔

☆......آس کا سرمایہ۔ از ب۔ د۔ کنول (بارہمولہ) (اشاعت ۷رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......قاتل۔ از شمیمہ اختر (رام باغ) (۹رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......خبر ہونے تک۔ از اقبال فہیم (راجوری کدل) (۹رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......سسکتے ارمان۔ از عبدالاحد بٹ (بٹہ مالو) (۹رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......آنکھیں۔ از سید کمال (حول) (۱۰رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......نیا انسان۔ از ایس ایم قمر (سرینگر) (۱۰رمئی ۱۹۷۰ء)

☆......خاموش محبت۔ از مدن مانتو (بارہمولہ) (۱۶رمئی ۱۹۷۰ء)

۱۹۷۰ء کے ایک شمارے میں دو کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ شمس الدین شمیمؔ کی کہانی ''مسرّت'' کا ایک اقتباس یوں ہے:۔

''ایک دِن ہم پارک کے تنہا گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مسعودہ کہنے لگی ''بشیر میری زندگی تمہاری زندگی سے وابستہ ہوچکی ہے۔ مجھے بھولنا نہیں۔ پیار کا ناٹک کھیل کر انجان نہ بننا''۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں کے کالے کالے جنگل آنسوؤں سے بھیگ گئے اور کافی ضبط کے باوجود دو قطرے رخساروں پر آٹپکے۔

''تمہارا مستقبل روشن ہوگا اور میں تمہارا ساتھی ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں تم میری ہو صرف میری''۔ میں نے مسعودہ کو تھپتھپا کر دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور پھر کچھ دیر کے بعد ہم وہاں سے باہر نکلے''۔[۱]

دوسری کہانی ایس ایم قمر کی ہے اور اس کا عنوان ہے۔ ''رات کا کفن''۔ قمر لکھتے ہیں:۔

''دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے کرب کی تیز ٹیس اُٹھ گئی۔ ایک آہ لبوں پر مسکراہٹ کی شکل میں تبدیل ہوکر تیرنے لگی۔ اس مسکراہٹ میں زندگی کا سارا زہر

---

[۱]: روزنامہ ''آفتاب'' ۳رمئی ۱۹۷۰ء

بھرا ہوا تھا۔ اس مسکراہٹ کے سائے سے اس کی آنکھیں ناگن کی طرح چمکنے
لگیں۔ وہ ناگن کی طرح پھنکارنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے جیسے دنیا کے تمام لوگوں
کو ڈس لے گی۔ غصّے کی تیز آندھیوں سے اس کی سانسیں بے قابو ہوگئیں"۔[۱]

دونوں کہانیوں کے اقتباسات پڑھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کشمیر کے اردو کہانی کار اسلوب اور فن افسانہ نگاری سے اپنی واقفیت کی بنا پر اُردو کے دوسرے افسانہ نگاروں سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ دوسری بات یہ کہ "آفتاب" جیسے عام لوگوں تک پہنچنے والے اخبار میں افسانوں کی اشاعت اردو ادب کی جانب لوگوں کی دلچسپیوں میں اضافے کا موجب ثابت ہوتی رہی ہے اور یہی وہ محاذ ہے جہاں اخبارات اردو ادب کی ترویج میں اہم رول ادا کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر سکتے ہیں۔

"آفتاب" کے عام شماروں میں کافی عرصہ کے لئے مقامی قلمکاروں کی ادبی نگارشات اتنی کثرت سے شائع ہوتی رہیں کہ اتوار کو چھپنے والے "ادبی ایڈیشن" کی اہمیت زیادہ نہ رہی۔ کیوں کہ ادبی تحریریں پڑھنے کے لئے اتوار تک انتظار کرنے کے بجائے ادب پسند قارئین روز ہی کوئی نہ کوئی افسانہ یا کوئی منظوم کلام (بعض اوقات ایک سے زائد) بہ آسانی پڑھ سکتے تھے۔ اس طریق کار سے بیک وقت کئی فوائد حاصل ہوئے۔ اولاً یہ کہ کشمیر کے اردو قلمکاروں کو اپنی صلاحیتیں پروان چڑھانے اور اپنی تخلیقات منظرِ عام پر لانے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ثانیاً یہ کہ اِس سے اردو شعر و ادب تک اخبار کے عام قارئین کی رسائی آسان ہوگئی اور ثالثاً یہ کہ اِس سے مدیران اخبارات کو بھی مواد کی فراہمی اور مالی منفعت کی صورت میں فائدہ ہوا۔ مجموعی طور پر سب سے زیادہ فوائد اردو زبان و ادب کو حاصل ہوئے کیوں کہ اردو کی جانب عام لوگوں کی دلچسپیوں میں اس سے بڑی حد تک اضافہ ہوگیا۔

اتوار کو چھپنے والے ادبی ایڈیشنوں میں سے چند ایک کی فہرست یوں ہے:

☆...... شمارہ ۹ جولائی ۱۹۷۲ء افسانے:۔ ایک تصویر کے کئی رُخ۔ ایس۔ مشتاق سرینگر +

۱: روزنامہ "آفتاب" ۳ر مئی ۱۹۷۰ء

یادوں کا کاروان۔قمر تسکین سرینگر + کاغذ کا کفن۔ایس ایم قمر سرینگر، بدتمیز کہیں کا۔ایم احمد میر میڈیکل کالج + خونی دہلیز۔ریاض احمد ریاض کلاشپورہ سرینگر۔

☆......۲۷ر اگست ۱۹۷۲ء:۔افسانے:۔عالمِ تصوّر میں۔جوگندر پال، کاش میں بہک نہ گیا ہوتا۔الطاف حسین میڈیکل کالج، وہ پاگل نہیں تھا۔خالد بشیر سرینگر، سمجھوتہ۔عمر مجید سرینگر۔

☆......۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۲ء۔افسانے:۔خزاں کے پھول۔فدا حسین شال شمس واری، جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔خالد بشیر سونہ وار سرینگر، مالک۔غلام نبی بٹ کوٹھار اسلام آباد، آگ کا دریا۔جواہرہ قمر سرینگر، ساحل کے تھپیڑے رضیہ تبسم۔عالی کدل سرینگر۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ''آفتاب'' میں چھپی (ادبی ونیم ادبی) نگارشات پر قارئین کے تبصرے ایک مستقل کالم ''خیال اپنا اپنا'' میں شائع ہوئے تھے۔اسی کالم میں ۷ارنومبر ۱۹۷۲ء کو قطب الدین پورہ سرینگر کے گلزار احمد کا ایک مراسلہ ''رضیہ تبسم پر نقل کا الزام'' کے زیر عنوان شائع ہوا۔جس میں انہوں نے ۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کے ادبی ایڈیشن میں شامل رضیہ تبسم کے افسانے ''ساحل کے تھپیڑے'' پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ''رضیہ تبسم نامی ایک خاتون نے اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی بے حد کوشش کی ہے لیکن حسرت ہے ایسے افسانہ نگار پر جس نے یہ افسانہ نقل کر کے لکھ دیا ہے اور اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانہ نگار نے نقل کرنے کے باوجود بھی افسانہ کے طرزِ تحریر اور اس کی جاذبیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے...... یہ ''شاہدہ کی ڈائری'' سے نقل کیا گیا ہے''۔[۱]

گلزار احمد کا یہ مراسلہ ایسا ہے کہ اس پر مزید کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لہٰذا اسے بلا تبصرہ رہنے دیا جاتا ہے۔

اتوار کے اِن ادبی ایڈیشنوں میں شاعری کے نمونے بہت ہی کم ملتے ہیں۔کافی عرصے کے بعد ۲۶ رنومبر ۱۹۷۳ء کے ''ادبی ایڈیشن'' میں دو غزلیں شائع ہوئیں۔ان میں سے ایک محمد عثمان عارفؔ (سرینگر) کی ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں۔

۱:۔روزنامہ ''آفتاب'' ۷ارنومبر ۱۹۷۲ء

تیرا مقام دل میں، گل و یاسمن میں ہے　　تو آفتاب حسن کی رنگیں کرن میں ہے
اے روحِ شعر، جانِ غزل، نغمۂ حیات　　تیری ادا، ادا میرے ذوقِ سخن میں ہے
گزری جدھر جدھر سے فضائیں مہک گئیں　　خوشبو تیرے بدن کی نسیمِ چمن میں ہے
پھر آج اُس کی نرگسی آنکھیں ڈبو گئیں　　پھولوں کا نور، ساغر، توبہ شکن میں ہے
اِک چھیڑ ہوگئی تھی کبھی اُن کے حسن سے　　اب تک حیاتِ منزل دار و رسن میں ہے

ایک اور غزل سلطان الحق شہیدی کاشمیری کی ہے، جس کے دو شعر یوں ہیں۔

آہ وہ شمع جل رہی ہے جو　　شام سے لے کر تا سحر تنہا
زندگی کی جھلستی راہوں میں　　درد دیکھا ہے ہمسفر تنہا

۳۱/دسمبر ۱۹۷۲ء کے شمارے میں بھی دو غزلیں شامل اشاعت ہیں۔ نگہت آراء (وومن کالج سرینگر) کی غزل کے دو شعر۔

مرے لرزتے لبوں نے جو اُن کا نام لیا　　مچل کے بادِ صبا نے بھی دل کو تھام لیا
مرے شباب کے پھولوں کی سادگی سے نگہت　　بڑے خلوص سے کانٹوں نے انتقام لیا

اسی شمارے میں بشیر گاش (سری نگر) کی غزل بھی چھپی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

دیکھا ہے بھلا کس نے گھمسان کے رن میں　　شمشیر مرے ہاتھ میں تھی یا کہ بدن میں
اے ساکنانِ جنت ارضی یہ ظلم کیوں　　پردیس ہم پہ چھا گیا ہے اپنے وطن میں

۸/مارچ ۱۹۸۱ء "ادبی ایڈیشن" میں "شاعری بے عمل قوموں کا نغمہ" کے عنوان سے عطا محمد میر (اسلام آباد کشمیر) کا مضمون اور غلام قادر وانی (جے این یو دہلی) کی غزل شاملِ اشاعت ہے۔ شاعری کے ساتھ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے عطا محمد میر نے جو زبان استعمال کی ہے، اُس سے کسی حد تک یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس صدی کی آٹھویں دہائی میں یہاں کے عام قلمکار کس قسم کی زبان استعمال کرتے تھے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ایک شاعر محوِ سوچ ہے اور اپنے لکھے ہوئے شعر کا وزن درست کرنے میں لگا ہوا ہے۔ کافی ذہنی جدوجہد کے بعد اس کے شعر کا وزن جب درست ہوا تو وہ خوشی سے

پھولے نہیں سمار ہا تھا۔ مگر شعر کے بے وزن ہونے سے پہلے بھی اس کی دنیا ویسی ہی تھی جیسی شعر کا وزن درست ہونے کے بعد۔ شعر کے وزن کی درستی سے اس کی زندگی وزن دار نہ بن سکی۔ شعر ٹھیک تو ہو اگر شاعر کو کچھ نہیں ملا۔ صاف ظاہر ہے کہ جو عمل اور کوشش انسان کی زندگی کو کوئی وزن نہ بخشے اور جس قسم کے غور و فکر سے انسان کو کچھ نہ ملے، وہ عمل اور کوشش اور غور فکر فضول اور بے معنی ہی تو ہے۔ ایسی لا حاصل کوششوں اور الفاظ سے کھیلنے سے حقیقت میں دنیا میں کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آتا''[1]

اقتباس کے آخری جملے پر غور کیجئے۔ اس میں دو بار ''سے'' اور تین بار ''میں'' کے علاوہ الفاظوں استعمال ہوا ہے، جو کہ عجیب سا لگتا ہے۔

اسی شمارے میں غلام قادر وانی کی جو غزل شائع ہوئی، اُس کے دو شعر یوں ہیں۔

حسن تیری کہانی ادھوری رہی	نامکمل غمِ عشق کی داستان
ہر قدم کا مرانی ادھوری رہی	شیخ صاحب کی محبت میں ہم جو چلے

فکاہی کالم:۔ کشمیر میں اردو زبان و ادب کی ترویج میں ''آفتاب'' کا جو بھی کردار رہا۔ اس کا تذکرہ اُس مشہور کالم کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا، جو آغازِ اشاعت سے لے کر اب تک برابر ''آفتاب'' کا مستقل کالم رہا ہے۔ میری مراد یہاں پر ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' سے ہے، جس کی ادبی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد یوسف ٹینگ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

''یہ کالم ایک کلاسیک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ پہلے تو اقبالؔ کے اس بے پناہ حسین مصرعے کو کشمیر سے متعلق تفکرات کے لئے عنوان کی حیثیت سے استعمال کرنا ایسا برجستہ ہے کہ خود اقبالؔ کی روح بھی عش عش کر اٹھی ہوگی۔ دوسرے اس کی تحریر میں ثناء اللہ آفتاب نے اپنے قلم کی جو جولانیاں دکھائی ہیں، اس نے اُسے ایک صاحبِ اسلوب بنا دیا۔ کچھ ''خضر'' ایسی مستقل اہمیت کے حامل ہیں کہ انہیں ادبی تذکروں میں نقل کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ افسوس کہ کبھی کبھی اتنے اچھے کالم

---

[1]: روزنامہ ''آفتاب''، ۸؍مارچ ۱۹۸۱ء

شائستگی اور نفاست کا اعلیٰ معیار قائم نہ رکھ سکے"۔ ۱

یہ سچ ہے کہ "خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے" کشمیر کے اردو اخبارات میں چھپنے والے تمام کالموں میں واحد کالم ہے، جو بلاناغہ گزشتہ پچاس برس سے "آفتاب" کے ادارتی صفحہ کی زینت بنتا رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بسا اوقات اِس کالم میں شرافت اور شائستگی کا دامن چھوڑتے ہوئے کالم نگار نے ایسی باتیں لکھیں، جو مزاحیہ ہونے سے زیادہ "ذاتی حملوں" کے دائرے میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر اس کالم کی (مزاحیہ) ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور جیسا کہ ٹینگ نے لکھا ہے کچھ "خضر" ادبی تذکروں میں نقل کرنے کے بھی قابل ہیں۔

یہاں پر تین مختلف زمانوں کے "خضر" نقل کرنا شاید بے جا نہ ہوگا۔

ا۔ "چشم ما روشن دل ما شاد...... اب کیا کہتے ہیں بیچ اس مسئلے اپنے مفتیانِ سیاست کہ...... اپنے مولانا فاروق بھی دیر آید درست آید مطلب یہ کہ ناک کی سیدھ، راہ راست پر آگئے ہیں اور فرمادیا ہے کل انہوں نے وعظ میں اپنے صاف صاف، کہ شیخ صاحب کشمیر کے مسلمہ اور واحد لیڈر ہیں اور جو شخص اُن کی "نئی لائن" سے انحراف کرے اللہ اس کو گول باغ میں بستر گول کرے۔ چلو اچھا ہوا۔ فاروق صاحب ویسے بھی بڑا دانا بینا ہیں۔ وعظ فرماتے ہیں تو پتھر دل پسیج جاتے ہیں یعنی پتھروں کے بھی آنسو پھوٹ پڑتے ہیں۔ علم و حکمت کا کلام شریف کرتے ہیں تو بقراط پانی پانی ہوجاتے ہیں۔ سیاست بیان کرتے ہیں، تو بڑے بڑے فلسفی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ دوراہوں کا ذکر کرتے ہیں تو دنیا کی بڑی بڑی جرنیلی سڑکیں چوپٹ ہوکر رہ جاتی ہیں۔ امن و اتحاد کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، تو تلقینِ غزالی معلوم ہوتی ہے اور پینترہ بدلتے ہیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہو۔ کردار پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو واعظ قوم کی پختہ خیالی کا مظہرِ جلال بن جاتے ہیں۔ اب لوگ ہی بتائیں کہ۔

کوئی کہاں تک لکھتا جائے، کوزے میں دریا کیسے سمائے

......اور پھر جب یہ کوزہ بھی جامع شریف کا ہو......" ۲

ا:۔ مضمون "کشمیر کی صحافت کا آفتاب" از محمد یوسف ٹینگ روزنامہ "آفتاب" ۱۲ رمئی ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳

۲:۔ "آفتاب" یکم جولائی ۱۹۷۲ء

۲:۔ "یہ بات لاجواب ہے' خیال ہے اور خواب ہے، ٹوٹی ہوئی طناب ہے۔ اگرچہ "ادھر بھی جناب ہے اُدھر بھی جناب ہے"۔ اور عیاں حساب کتاب ہے، پھر بھی رعب وداب ہے کہ...... ووٹ شماری جاری ہونے دو، ساری کسر نکالی جائے گی۔ پچھلے زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تب شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہوگا لیکن اب تو جھوٹ ہی کرتا دھرتا اور سب کچھ کرتا پھرتا ہے مطلب یہ کہ اس زمانے میں جھوٹ کے پاؤں ہی نہیں بلکہ چار پہیے ہیں اور چونکہ وہ تیزی سے دوڑتا ہے، اس لئے سچ کے مقابلے میں اسی کی حکمرانی ہے اور من مانی کرنے والوں ہی کی کہانی زبانی سُنائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ووٹ شماری میں گڑبڑ گوٹالے کی تیاری ہے، گویا بے چاری جمہوریت سرراہ کی بین سُنائی دیتی ہے۔ خبر ہو سو ہو، دو تین دِن باقی رہ گئے ہیں، دیکھئے ہوتا ہے کیا، کھوتا ہے کون اور روتا ہے کون؟" ...... (آفتاب۔ ۲۵ردسمبر ۱۹۸۳ء)

"خضر سوچتا ہے......" کے علاوہ ۱۹۸۴ء میں ادارتی صفحہ پر ہی ایک اور فکاہی کالم "خبر زینہ کدل" شروع ہوا، جسے خود ثناء اللہ بٹ جلیل جالکدوز کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ اِس کالم میں "خضر" کی طرح بعض شخصیات کا ازراہِ مذاق ذکر کیا جاتا اور اس کا موضوع عام طور پر سرینگر کی سیاسی صورتحال ہوتا تھا۔ تاہم بعض اوقات اس کالم میں اچھے مزاحیہ نمونے بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ یہاں پر صرف ایک کالم نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، جس کا عنوان ہے: نہ حکایت نہ شکایت۔

"خداوند کریم بخشے، اپنے خالق ڈی سی کو، نہ معلوم آج کل کِس حال میں ہوگا کسی زمانے میں اسلام آباد کا ڈی سی ہوا کرتا تھا کہ اسی دوران یہاں الیکشن کا اعلان ہوگیا۔ لیکن وہ کوئی اناڑی نہیں تھا بلکہ بڑے غضب کا کھلاڑی تھا۔ اس لئے اُس نے بڑی شہرت پائی کیوں کہ اُس نے اُمیدواروں کے کاغذات کی ایسی جانچ پڑتال کی، فیلڈ میں اترے بغیر ہی ضلع اسلام آباد کے چودہ کے چودہ اُمیدواروں کو مین آف دی میچ قرار دے دیا۔ خالق ڈی سی جیسے کھلاڑی کے مقابلے میں باغِ نشاط کی نمکدانی یعنی عبدالخالق وانہ بالکل اناڑی نکلا۔ اگاڑی دیکھ اور نہ پچھاڑی اور بیگم عبداللہ کی گاڑی پاس کردی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بے چارے کا ستیاناس کر دیا گیا...... اور وہ جو......

''جب تم ہی چلے پردیس لگا کر ٹھیس پریتم پیارا...... مطلب یہ کہ وہ غلام قادر پردیسی بے چارہ بھی بالکل مفت میں مارا گیا اور وہ سنا ہے دیس سے نکل کر اب واقعی پردیسی ہوگیا ہے۔ کچھ لوگ اپنے شاہ صاحب کو اب بڑا اچھا ایمپائر ماننے لگے ہیں، کیوں کہ انہوں نے اپنے دو کھلاڑی آؤٹ ہوجانے کے بدلے درجنوں عمران خانوں، ظہیر عباسوں اور سرفراز نوازوں کو یک بیک فیلڈ سے ہی آوٹ کر دیا اور اُن کی جگہ نئے کھلاڑی میدان میں لے آئے''۔

''آفتاب''۱۹ر جنوری ۱۹۸۵ء)۔

فکاہی اور مزاحیہ رنگ میں لکھی جانے والی ان چار تحریروں پر ایک نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ ''خضر'' اور ''خبر زینہ کدل'' کے زیر عنوان کالموں کی زینت بننے والی ان تحریروں میں طنز و مزاح سے زیادہ سخن آرائی اور لفاظی پر توجہ دی گئی ہے اور بات جس انداز میں کہی گئی ہے، اُس سے ہدفِ مزاح بننے والے اشخاص پر ایسی چوٹیں پڑی ہیں، جو گہرے گھاؤ تو دے سکتی ہیں، لیکن گھاؤ پر پھاہا رکھنے کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس کے برعکس طنز و مزاح میں طنز نگار چوٹ کچھ اس طرح سے کرتا ہے کہ چوٹ سہنے والا اِسے ''اپنی ذات پر رکیک حملے'' سے تعبیر نہیں کرتا بلکہ اُسے چوٹ سہتے ہوئے ایک عجیب قسم کے لطف کا احساس ہو جاتا ہے

سُرخیاں: ''آفتاب'' کی اردو کے سلسلے میں خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اُن سرخیوں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، جو پرانی فائیلوں کی ورق گردانی کے دوران میری نظروں سے گزریں اور کسی نہ کسی صورت میں کشمیر میں اُردو کی ترویج کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً اِن میں سے بعض سرخیاں اتنی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی ہیں کہ ایک دم اخبار کے قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جلی حروف میں لکھی گئی جاذبِ نظر سرخی نظروں سے گزر کر اخبار کے قاری کے ذہن پر بھی اثر انداز ہو جاتی ہے اور اگر سُرخی کے الفاظ نئے اور تراکیب انوکھی ہیں، تو قاری کے ذہن میں محفوظ ذخیرہ الفاظ میں ہلچل بھی مچا دیتی ہے یوں عوام و خواص میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ساتھ اخبار کی سرخیوں کا بھی ایک تعلق ہے۔

''آفتاب'' کی خبروں سے متعلق اِس منفی پہلو کی جانب ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اس

کے ابتدائی دور کے عام شماروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے گردو پیش میں اگر کوئی کام سب سے زیادہ ہوتا ہے تو وہ اغوا کاری، جنسی آوارہ گی، قتل و غارت گری اور حُسن و عشق کی چھیڑ خوانی کا ہے۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر میں صرف ایک شمارہ میں چھپنے والی خبروں اور خبری رپورٹوں (News Reports) کی سرخیوں کو درج کرر ہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے ۸ رفروری ۱۹۶۰ء کے شمارے کے صفحہ نمبر ۳ کی یہ صفحہ ۷ سرخیاں:۔

☆ عاشق کے خود کشی کرنے پر محبوبہ نے بھی خود کشی کر لی۔ مقتولہ اچانک عدالت میں حاضر ہو گئی۔

☆۔ بے روزگاری سے تنگ آکر تعلیم یافتہ نوجوان نے زہر کھالیا ☆ لڑکی کو دریا میں پھینکنے کے الزام سے ماں بری/کسی نے جب میرا بوسہ لیا، اُس وقت کار سمندر کے ساحل سے گزری تھی۔ ☆ ایک ۲/ ۱۴ سالہ بچے کی لاش ۵۶ دِن بعد آج دفن کی جائے گی ☆ صدرِ روس تمبا کو نوشی کے مخالف ہیں۔

اِس کے علاوہ درج ذیل سنسنی خیز سرخیاں بھی ملاحظہ ہوں:۔

☆ صدر رونالڈ ریگن نے چھریاں تیز کرنا شروع کر دی ہیں (۶ر مارچ ۱۹۸۱ء)

☆ برطانیہ میں تیرہ طوائفوں اور پانچ بچوں کا قاتل خدائی اشاروں کے دعوے کرتا ہے۔ (۱۸ر جون ۱۹۸۱ء)

☆ لال چوک میں ایک خاتون کے دو خاوندوں میں تصادم (۳۱ر مئی ۱۹۷۰ء)

☆ صدر سادات دم بخود ہو گئے۔ (۴ر مارچ ۱۹۸۱ء)

☆ گود خالی کی خالی ہی رہی۔ (۳ر مارچ ۱۹۸۱ء)

☆ لاہور کی فیشن ایبل خاتون سمگلنگ کرتے ہوئے پکڑلی گئی۔ (۳ ر مارچ ۱۹۸۱ء سرخیاں'' جمانے'' کا ایک اور پہلو جو خاصا دلچسپی ہے، یہ ہے کہ کئی جگہوں پر بعض انگریزی الفاظ اور نا مانوس تراکیب کا ایک ہی خبر کی سرخی میں بار بار استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً درج ذیل صفحہ اوّل کی سرخیوں کے خط کشیدہ الفاظ:۔

☆ غنڈہ گردی کے خلاف وزیراعظم کی سخت وارننگ۔ سیاسی حقوق کے نام پر غنڈہ گردی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (۹رجنوری ۱۹۶۰ء)

☆ چین بیس کروڑ جوانوں کی ریزورفورس تیار کر رہا ہے۔ یہ دنیا میں سے بری ریزورفورس ہوگی۔ (۱۸رفروری ۱۹۶۰ء)

☆ ۔پانچ نوعمر فیشن ایبل طالب علم گرفتار (۳رفروری ۱۹۶۰ء)

☆ پولٹیکل کانفرنس کے عُفرلہ ہونے کا سنسنی خیز پس منظر۔اہم انکشافات (۲۵راپریل ۱۹۶۰ء

☆ ترکی میں انقلاب کیوں ہوا؟ (۱۵رجون ۱۹۶۰ء)

☆ مرحومہ اندرا گاندھی کی آج آخری رسومات۔ پورے قومی اعزاز سے اُن کی ارتھی اٹھائی جائے گی۔ (۳۱رنومبر ۱۹۸۴ء)

☆ مرحومہ وزیراعظم کی استھیاں درشن کیلئے رکھی گئیں (۶رنومبر ۱۹۸۴ء)

☆ سات وزیر شنٹ آوٹ کردیئے گئے۔ (۲۹رمئی ۱۹۷۰ء)



☆...... معراج حبیب

خواجہ ثناء اللہ بٹ۔ سچائی کا پرستار

سچ بولنا، حق پر چلنا اور بے باکی کے ساتھ کام کرنا ایک مذہبی فریضہ ہی نہیں بلکہ یہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے کیونکہ دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو حق اور سچ کی آواز بلند کرتے ہیں، باطل اور جھوٹ کے سامنے نہیں جھکتے اور اپنے اصول پسندانہ موقف پر ساری زندگی کوہِ گراں بن کر ایسے ڈٹے رہتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اُنہیں ہلا نہیں سکتی، دبا نہیں سکتی اور ہیچ نہیں کر سکتی ہے۔

جی ہاں! میرا مطلب وادیٔ کشمیر کے معروف صحافی خواجہ ثناء اللہ بٹ سے ہے جنہوں نے اپنی پچپن سالہ صحافتی زندگی ملت و معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے وقف رکھ کر وقت کے بے درد سیاست دانوں، بے رحم حکمرانوں، خود غرض سماجی رہنماؤں اور نافہم مذہبی پیشواؤں کے خلاف اپنی قلمی جنگ جاری رکھی اور ثابت کر لیا کہ نجی مصلحت اور مفاد کو ایک دِن چھوڑنے والا اور خلوص کے ساتھ زمانے اور حالات سے لڑنے کی قوت رکھنے والا بلا خوف و کھٹکا اپنی آراء قلمبند کرنے اور انہیں عوام تک لانے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا، چاہے نتائج کچھ بھی ہوں۔

بظاہر یہ کوئی مبالغہ ہے اور نہ کوئی جذباتی دلیل بلکہ یہ ایک دائمی سچائی ہے کہ صحافت ایک روشن مشعل ہے اور صحافی وہ رہنما جو یہ مشعل ہاتھ میں تھامے ہوئے زمانے اور حالات کی بھول بھلیوں میں راستہ تلاشنے والوں کی رہبری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس تناظر میں زندگی کے کسی بھی شعبے پر نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے کہ سچے اور غیر جانبدار قلم کار، صحافی، ادیب اور نقاد ہی معاشرتی اقدار کی بقاء کے مضبوط ستون رہے ہیں، ڈیڑھ سو سال کے

زمانے اور حالات پر ہی نظر ڈالی جائے تو سر سید احمد خان نے جس تحریک کو جنم دیا وہ حقائق کی ایک بڑی مثال ہے۔ مولانا حالیؒ نے قوم کے سوچنے کا انداز ہی بدل دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں نے سوئی قوم کو جگایا۔ شبلی، محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، اس قبیل کے دیگر ادیبوں نے کایا ہی پلٹ دی۔ اس اعتبار سے وادیٔ کشمیر کے خواجہ ثناء اللہ بٹ کی خدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو وہ بھی کافی حد تک اُنہی ادیبوں، صحافیوں اور نقادوں کی قبیل میں شمار کئے جاسکتے ہیں جنہوں نے صداقتوں کے عاشق بن کر حقائق کی تلاش کی سچائیوں سے محبت اور بُرائیوں سے نفرت کی اور انہیں محسوس کر کے الفاظ میں پرویا اور قلم کی دلیل سے منظرِ عام پر لانے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کیا۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ جنہیں وادی میں عرف عام ''سونہ آفتاب'' کے نام سے جانا جاتا ہے، نے اپنی طویل صحافتی زندگی ایسی ہمہ جہت اور بامشقت بنائی تھی کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک تحریک کی حیثیت پیدا کر گئے تھے۔ وہ اُن کیفیات اور حالات و واقعات کا آئینہ بن گئے جو نہ صرف ملک و ریاست اور معاشرے میں رونما ہوتے تھے بلکہ جو معاشرے کے ہر طبقے سے وابستہ افراد روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اپنے وسیع مطالعات، تجزیات اور تجربات سے فکری اور شعوری طور اتنے بالغ تھے کہ تاریخ کے مختلف ادوار کے حال و احوال اُن کے ذہن و قلب کا حصہ بن گئے جن کے پس منظر اور پیش منظر اُن کی نگاہ ملک و قوم اور اپنے معاشرے کے ہر مسئلے اور ہر معاملے میں گھر کر گئی تھی۔ دینیات، سماجیات اور سیاسیات سے واقفیت اور معاشیات، اقتصادیات اور اصلاحات سے باخبر ہونے کے باوصف ہر معاملے اور ہر مسئلے میں اُن کی وضع و قطع، اُن کے سوچنے، لکھنے اور بولنے کے انداز میں اعتدال رہتا تھا۔ سچے اور غیر جانبدار صحافی ہونے کے ناطے امن و سلامتی اور خوشحالی کے دلدادہ تھے، باہمی اتحاد، یگانگت اور یکسوئی کے حامی تھے اور ظلم، جبر و استبداد، تباہی اور بربادی کے مخالف تھے۔ حق کو حق اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے میں کبھی نہیں گھبراتے تھے اور نہ چور کو چور کہنے میں شرماتے تھے۔ بہ حیثیت انسان وہ اپنی فطرت کبھی فراموش نہیں کرتے اور نہ ہی خواہشات کے غلبے کے نیچے اپنی

فطرت کو دفن کرنے پر آمادہ دکھائی دیتے تھے۔ گویا اپنے مقصدِ تخلیق سے بھی آشنا تھے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن کے نتیجہ میں وہ ''بابائے صحافت'' بھی کہلاتے ہیں۔

خواجہ صاحب ۵۷ سال قبل جموں کشمیر میں اُس وقت صحافت کے اُفق پر نمودار ہوئے جب یہاں کی صحافت بھول بھلیوں میں تھی، ۱۹۴۷ء کے ہندوستان کے بٹوارے اور پھر جموں و کشمیر میں سن ۱۹۵۳ء کے واقعے سے صحافت کا سفر انتشار اور افتراق میں بھٹک گیا تھا، کشمیر میں شائع ہونے والے اخباروں سے کشمیری عوام کو کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور بیرونِ ریاست کا اگر کوئی اخبار بھی آیا کرتا تھا وہ بھی پنڈت طبقے کے کچھ افراد ہی پڑھا کرتے تھے اور بقولِ خواجہ صاحب عام لوگوں میں اخبار پڑھنے کا رواج تھا اور نہ کوئی ذوق وشوق۔ یعنی وادی کی صحافت گُہر آلود تھی، صحافتی کرنیں دُھندلی اور صحافتی راہیں سنگلاخ تھیں۔ ان حالات میں خواجہ صاحب کے ''آفتاب'' کا طلوع ہونا اور اس کی شعاعوں سے اردو کے قارئین کو تازگی اور تنوّع کا احساس دلانا اور عوام کی آواز بن کے اُن کے دلوں کے تار چھیڑنا واقعی کمال تھا۔ آفتاب کے امیر نے اپنے قلم کے ذریعے بیک وقت ادب اور صحافت کو نئے سرے سے سجایا سنوارا اور دونوں شعبوں کو ایسی وسعت اور رفعت بخشی کہ وادیٔ کشمیر کی صحافت سے گُہر اٹھنے لگا اور گلشنِ صحافت کی مہک وادی میں پھیلنے لگی، لوگوں میں اخبار بینی کا ذوق پیدا ہوا۔ خواجہ صاحب نے اپنی غیر رسمی، سلیس اور پُر قوت عبارت سے نہ صرف لوگوں کو اخبار کی طرف مائل کر دیا بلکہ اُن میں اخبار خریدنے کی بھی عادت ڈال دی۔ اپنے طنزیہ کلام کے رنگِ فصاحت سے قارئین میں مقبولیت اور اعتباریت حاصل کر کے وادی کے صحافتی اُفق پر ایک درخشاں ستارے کی طرح اُبھر کر صحافت پر چھائی ہوئی تاریکی دور کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو اپنے فہم وادراک سے ملت کی زبان بن کر اُجاگر کیا، ترجیح اور فوقیت کے ساتھ سماج میں فروغ پارہی بُرائیوں اور خرابیوں، بے راہ روی، رشوت خوری، بددیانتی اور دین بے زاری کی طرف اشارے دینے کا جو عمل انہوں نے تواتر کے ساتھ جاری رکھا وہ نہ صرف اُن کی معاشرتی فلاح و بہبود کے تئیں خدمت کی دلیل ہے بلکہ انہیں منفرد شخصیت بنانے کا بھی باعث بنا۔ صحافت کے

اُفق پر سچائی، بے باکی اور استقلال کے زیورات سے آراستہ ہوکر اُنہوں نے ریاست میں صحافتی ولولہ اور اہمیت کا جذبہ متعارف کرانے کے لئے جو منفرد رول نبھایا وہ واقعی رہنمایانہ ہے اور ناقابل فراموش بھی کیونکہ ایک بہترین قلم کار، معروف صحافی، منجھے ہوئے نقاد اور سلجھے ہوئے محقق کے طور اُبھر کر بھی انہوں نے کبھی قلم کی آبرو کو نہیں بیچا اور مرتے دَم تک قلم کی عزت رکھی۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف صحافت کے معیار کو بہت اونچا کیا بلکہ اپنی ہستی کو بھی یکتائے زمانہ بنا دیا۔

گرچہ وقتِ پیری میں بھی خواجہ صاحب کے مزاج میں تندی و طراری برقرار تھی لیکن اوصاف عاشقانہ اور درویشانہ تھے، زبان طنز کے تیر چلانے سے عاری نہ تھی، جسم، ضعیفی سے چلنے پھرنے کی سکت اور لکھنے کے لئے ہاتھوں کی قوت بہت سُست ہو چکی تھی مگر زندگی ہمہ جہت تھی، ذہن بیدار تھا، صحافتی اور ادبی شعور برقرار تھا، غضب کی یاداشت تھی اور فکر و شعور کی گہرائیوں میں اُتر کر بولنے کی صلاحیت قائم تھی۔ جب وہ مجھے ڈکٹیشن دیتے تو پہلے خبر کی سرخی، اداریہ یا طنزیہ کالم "خضر سوچتا......" کا عنوان دیتے تھے۔ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے اور اپنی دی ہوئی سرخی یا عنوان کا متن بیان کرتے تھے، حیرت کی بات تھی کہ جب تک مضمون کا اختتام نہیں ہوتا، تب تک زبان نہیں رُکتی اور نہ ہی بیان کے دوران کسی قسم کی کوئی ہیر پھیر یا کوئی تصحیح ہوتی البتہ آنکھیں بند کرنے کے دوران خواجہ صاحب کے دونوں ہاتھوں کی دسیوں انگلیوں میں ایسی حرکت جاری رہتی تھی جیسے وہ کسی ٹائپ رائٹر یا کمپیوٹر کے کی بورڈ (Key Board) پر کام میں مصروف ہوں۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ان کے مضمون میں کچھ سطروں کے اضافے کی ضرورت پڑتی تا کہ مضمون کے لئے مخصوص جگہ کی مناسب ڈھنگ سے بھرپائی ہوکر گیٹ اَپ برقرار رہ سکے لیکن کافی حجت کے بعد بھی اُن سے یہ کام کروانا جوئے شیر لانے کے مترادف جیسے بن جاتا تھا، اگرچہ اُن کے لئے آفتاب ہی سب کچھ تھا لیکن دل معصوم بچے کا تھا۔ پراسٹیٹ کے آپریشن کے بعد خواجہ صاحب کی جسمانی قوت میں مزید گراوٹ آ گئی تھی لیکن وہ اپنے مخصوص کالم بلاناغہ لکھوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے، بیک وقت صحافی، ادیب اور نقاد کا کردار ادا کرتے اور اپنی تحریروں میں خیال یا بیان میں کسی قسم کی کوئی پستی نہیں آنے دیتے تھے۔ ہر اعتبار سے

باحوصلہ اور پُر اعتماد تھے، حالات و واقعات کو اپنے لفظوں میں ڈال کر جس اسلوب یا ترکیب کو معنی خیز سمجھتے تھے دیانتداری کے ساتھ سپردِ قلم کرتے اور شائع کرواکر منظرِ عام پر لاتے تھے۔ کبھی کسی نازک موضوع پر بھی ان کے قلم سے بلا جواز اور دانستہ طور تلخ جملوں کی ادائیگی ناممکن تھی، اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے اور رواداری کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے تھے۔ ایک سچے کشمیری تھے، اُن کے ساتھ کام کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ خوشگوار ماحول میں بات چیت سے اندازہ ہوتا کہ وہ کشمیری معاشرے کو پاکیزہ خیالات اور مستحکم عزائم کے ساتھ اپنے حالات تبدیل کروانے کے حامی تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے انہیں روایتی زنجیروں اور دقیانوسی خیالات سے نجات دلوانے کی سعی کرتے، انہوں نے صحافت کو عیاشی اور آسودگی کا ذریعہ نہیں بلکہ معاشرے میں تبدیلی لانے کا ذریعہ بنایا تھا اور صحافی کا فریضہ انجام دینے کے لئے قلم کو ضابطے کا پابند بنایا تھا، نہ کبھی اپنے پہ گزرنے والے کڑے حالات کا تذکرہ کرنے کا شغل اختیار کیا اور نہ ذاتی رنج والم کے قصے کہانیاں سنانے کا شوق دکھایا۔ بس اپنی قوم پر روزمرہ پیش آنے والے مصائب و مشکلات اور اُن کے دکھ درد سے اُٹھنے والی ٹیس کو ہی اپنی ذات سے منسوب رکھا۔ اُن کی شخصیت کا جب میں نے قریب سے تجزیہ کیا تو مجھے یہ چیز صاف نظر آئی کہ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔ اُن کا خدا سے گہرا تعلق تھا، اسلام سے محبت کا شعلہ ان کے اندر روشن تھا، وہ جب بھی اللہ اور اللہ کے رسول کا کوئی فرمان یا احکام سنتے تو جیسے دنیا و مافیا سے بے خبر ہو جاتے، وہ ہمیشہ دینِ اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونے پر زور دیتے تھے، اس لئے وہ ہر گز خشک مزاج اور تارک الدنیا انسان نہ تھے بلکہ شگفتہ مزاج اور خوش گو شخص بھی تھے۔ اُن کی مالی حالت اگرچہ اچھی تھی اس کے باوجود فضول خرچی کے روادار نہیں تھے۔ پرانی وضع قطع کے دفتری کمرے میں زندگی انتہائی سادگی کے ساتھ گزار رہے تھے۔ اپنے دوستوں اور قرابت داروں سے جب گفتگو میں مشغول ہو جاتے تھے تو ہر معاملے میں اُن کی یادگار اور دلچسپ باتیں تاریخی حوالوں اور حیرت انگیز مشاہدوں کے ساتھ سُن کر جی چاہتا تھا کہ بولتے ہی رہیں۔ صحافت کے بارے میں جب کبھی کوئی بات چھڑ جاتی تو بہت کچھ سکھا کر، سمجھا کر لکھنے کا موقعہ فراہم کرکے

حوصلہ افزائی کرتے رہتے اور مختلف موضوعات کے تئیں قلم کی دلیل سے سچے اور غیر جانبدار صحافی کا کردار ادا کرنے کے رموز سے بھی واقف کراتے۔ اس لحاظ سے وہ نہ صرف اُستاد، بلکہ میرے محسن بھی تھے۔ مجھ سے بار بار یہ بات یہ کہتے تھے کہ ''صحافی یا ادیب صرف صحافی یا ادیب نہیں ہوتا، وہ بھی اسی معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے جس کے ہم اور آپ ہیں۔

خواجہ صاحب کی شہرت اور ہردلعزیزی سے متاثر ہوکر سیاست دان، حکمران، وزراء، افسران اور دانشور اُن سے ملنے کا اشتیاق رکھتے تھے لیکن وہ کسی کے ساتھ زیادہ مراسم قائم کرنے یا تعلقات بڑھانے کے مشتاق نہ رہے۔ بڑے بڑے سیاست دان، وزیر، امیر اور افسر بغیر اجازت اُن سے ملنے کی جسارت تک نہیں کرتے تھے۔ گویا سچائی کا یہ پرستار نہ صرف اپنی مرضی کا مالک تھا بلکہ مختلف معاملوں میں بالکل بے خوف بھی تھا اور گوشۂ تنہائی کو ہی اپنا مسکن بنانے میں ملکہ حاصل کرلیا تھا۔

خواجہ صاحب کے ساتھ بارہ سال تک قریب رہنے اور اُن کے اخبار میں کام کرنے کے دوران مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اپنی زندگی میں مجھے جو بھی لوگ ملے یا جن لوگوں سے میرا واسطہ پڑا، اُن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو اپنی انفرادیت اور انوکھے پن کی وجہ سے میرے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ چکے ہیں لیکن جس کردار نے میری یادوں میں انمٹ نقوش ثبت کئے، وہ خواجہ صاحب ہی تھے۔ وہ گوناگوں خوبیوں کے مالک اور اپنی تحریروں میں سچائیوں اور صداقتوں کے مظہر تھے، وہ باشعور تھے مگر اپنی شہرت کا گھمنڈ نہ تھا، وہ باعزت تھے جن کی شرافت بہت مثالی تھی، وہ پُر خلوص تھے مگر ہمیشہ اپنے خلوص کے ساتھ تنہا رہے۔ جسم کے در و دیوار میں لمبی عمر تک قید رہے اور بغیر کسی آہٹ کے آزاد بھی ہو گئے۔ اُن کی بہت باتیں ذہن میں محفوظ ہیں جنہیں ایک ساتھ بیان کرنے کی مضمون کی طوالت اجازت نہیں دیتی۔

خواجہ صاحب ۲۴ رنومبر ۲۰۰۹ء میں اس دنیا سے چلے گئے مگر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اُن کی روح آج بھی آفتاب کے دفتر میں ہمارا مشاہدہ کر رہی ہے۔ اللہ انہیں مغفرت اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

............●●●............

☆...... مرزا بشیر احمد شاکر

روزنامہ نامہ آفتاب ۔ مشاہیر کی نظر میں

مرحوم خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب کا اسمِ گرامی صحافتی تاریخ میں بلا شک آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ صحافت نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہو تو یہ ایک مقدس اور باوقار پیشہ ہے۔ اِس تناظر میں اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو ثناء اللہ مدیر آفتاب کی ذاتِ گرامی لائق ستائش وصد آفرین ہے کہ جس نے انتہائی نامساعد حالات اور بے سروسامانی کے عالم میں وادیٔ کشمیر میں روزنامہ آفتاب کا اجرا عمل میں لایا۔ اُن دِنوں یہاں سیاسی ابتری، ظلم وستم، سماجی اور طبقاتی نابرابری اور غربت وافلاس کا عالم تھا مگر اِس سب کے ہوتے ہوئے بھی اس محترم نے بالکل جوانمردی اور صبر وسکون کا دامن تھام لیا اور تیز اور تند آندھیوں کے تھپیڑوں میں آفتاب نکال کر تاریک راہوں کو روشن کیا جو آج بھی کئی دہائیاں گزرنے کے بعد بھی روشن نظر آتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش کہ جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

اقبالؔ

اگر چہ علامہ اقبالؔ کا درج بالا شعر زمانہ حال پر دلالت کرتا ہے مگر عشق آتش کی چنگاری سے یہ روشن اور تابناک چراغ اپنے بانی کی یادوں کو ہر زمانے میں حساس دِل اور ذہنیت رکھنے والوں کو تازگی بخشتا ہے اور آج بھی پایا ہے صحافت کے جاننے والے اپنے محسن اور صحافت کے

شہسوار، اُن کے احسانات کے بوجھ سے دَبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کتنے ہی نوجوان قلمکار تھے جن کو خواجہ صاحب نے اپنے اخباری دفتر میں بٹھا کر قلم تھامنا سکھایا اور صحافت کے اصول اور آداب سے آشنا کیا۔ ان میں سے اکثر آج خود اپنے اخبارات نکالتے ہیں اور اپنی روزی روٹی کما کر اطمینان کی زندگی گزارتے ہیں۔

مجھے اپنی جوانی کے دِن یاد آرہے ہیں جن دِنوں اخبار ''آفتاب'' کی قیمت صِرف دَس پیسے ہوا کرتی تھی اور ہاکر اکثر پیدل یا سائکل پر سوار ہو کر یہ روزنامہ سڑک سڑک اور گلی گلی گھوم پھر کر بیچا کرتے تھے۔ اُن دِنوں T.V یا موبائل کا رواج نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ریڈیو کا چلن تھا اور لوگ یہ اخبار بڑے شوق سے خریدتے تھے۔ 60 سیٹوں والی گاڑیاں سرینگر میں چلتی تھیں اور دو ایک مسافر اگر سامنے بیٹھ کر اخبار پڑھتے تھے تو اُن کے پیچھے سے بیتابی کے ساتھ اکثر سواریاں اُن سے اخبار پڑھنے کا تقاضا کرتے تھے اور رفتہ رفتہ یہ اخبار بالکل پچھلی سیٹوں میں بیٹھے مسافروں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا تھا۔

بابائے صحافت کا اخبار ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' والے طنزیہ کالم سے بے حد پُرکشش ہوا کرتا تھا۔ قارئین اِس کالم کو بڑے شوق وذوق کے ساتھ پڑھتے تھے کیونکہ اس میں خواجہ صاحب کی بھرپور صلاحیت اور زورِ قلم نظر آتا تھا۔ سماجی برائیوں پر چوٹ ہوا کرتی تھی۔ ناانصافی اور نابرابری کا ظرافت آمیز طنز کیا جاتا تھا۔ مرحوم خواجہ صاحب نہ صِرف اخبار نویس تھے بلکہ وہ مظلوم کشمیریوں کے ترجمان بھی تھے اور وہ تاریخ دان بھی تھے۔ اپنی حیات میں انہوں نے تاریخ کشمیر سے متعلق بھی کتابیں شائع کیں۔ جن کو پڑھ کر اُن کی سیاسی سوجھ بوجھ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو کئی اوصاف سے متصِف فرمایا تھا۔ وہ کسی بڑے سے بڑے حکمران کے دَر پر نہیں جاتے تھے بالکل بہت سارے سربرآوردہ اشخاص ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ مادرِ کشمیر کے اِس بطل جلیل فرزند کو جاہ وحشمت کی کوئی تمنا نہ تھی۔ وہ بے نیاز ہو کر فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عالیشان کوٹھی یا بنگلہ بنانے سے احتراز کیا اور صورہ سرینگر میں ایک چھوٹا سا دو تین کمروں پر مشتمل رہائش گاہ تعمیر کی تھی جس کے صحن میں

یہ مردِ درویش آج اکیلا اور یکتا و تنہا منوں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہا ہے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دِلش زندہ شد بعشق

ثبت اَست برجَریدۂ عالم دوام مَا

آفتاب نے اپنا جشنِ زرین ۲۰۰۶ء میں منایا اور پورے آب و تاب اور دھوم دھام کے ساتھ، اِس مسرت اور شادمانی کے موقعہ پر بڑے بڑے قلمکاروں، تجزیہ نگاروں، سیاست دانوں اور دانشور حضرات نے اپنا دِل کھول کر مرحوم خواجہ صاحب اور اُن کے جاری کردہ آفتاب کے مضامین اور مکاتیب کے ذریعہ بہت سراہنا کی اور اعترافِ حق کیا اور کافی داد و تحسین دِی۔ اِس سلسلے میں "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر مکاتیب وغیرہ سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

"آپ کے اندازِ خسروانہ اور کجکلاہی کو دوسرے احباب کے لئے چھوڑ کر، میں آفتاب کے قارئین کو اس وقت خصوصیت کے ساتھ، آپ کی اس درویشی کی یاد تازہ کرنے پر اکتفا کروں گا جس کے تحت آپ نے پچاس سال پہلے آفتاب کی ڈیمی تیار کرتے وقت علامہ اقبالؔ کی اس دعا پر اُس وقت عملی آمین کہی جب اقبالؔ کا نام لینا بھی کارے دارد تھا۔

خدایا آرزو میری یہی ہے　　میرا نورِ بصیرت عام کر دے

اس دُعا پر عملی آمین کہتے ہوئے اپنے روزنامہ کیلئے وہ نام چن لینا بھی آپ کی اقبالؔ دوستی کا ثبوت ہے جو ایک علامت کی حیثیت سے علامہ کی شاعری میں کئی جلوے بکھیرتا ہے مثلاً بانگِ درا کے ان شعروں میں ۔

اے آفتاب! روحِ و روانِ جہاں ہے تو　　شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے　　چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

تحریر پروفیسر مرغوبؔ بانہالی

بحوالہؑ: آفتاب ۱۶ جولائی ۲۰۰۶ء

"وادی سے شائع ہونے والا روزنامہ "آفتاب" برس ہا برس سے اپنے مستقل کالم

''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' کی بدولت پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ یہ کالم جسے اخبار کے مدیر اعلیٰ خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب بطور خاص قلمبند کرتے ہیں۔ اصل میں کسی سیاسی، سماجی، اقتصادی یا ادبی واقعہ یا کسی شخص کا خاکہ پیش کرتے ہیں، ویسے ہی جیسے کبھی کبھار مصوّر کا برش ایک ہی سٹروک سے سب کچھ کہہ جاتا ہے آفتاب اپنی گولڈن جبلی منا رہا ہے۔ میں اس موقعہ پر خواجہ صاحب کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نور شاہ۔ راول پورہ سرینگر

(بحوالہ آفتاب ۱۶ جولائی ۲۰۰۶ء)

بے کسوں اور مظلوموں کا ترجمان آفتاب

آفتاب ایک طرف چوروں، مگرمچھ رشوت خوروں، ملاوٹ خوروں، ذخیرہ اندوزوں، راہزنوں اور بے ایمانوں کے لئے شمشیرِ برہنہ واقع ہوا ہے تو دوسری طرف بے کسوں مظلوموں کا ترجمان اور دِل کی دَھڑکنیں۔ محترم خواجہ صاحب! دنیا کا آفتاب غروب بھی ہوتا ہے لیکن وادی کے افق پر آپ کی صحافت کا آفتاب غروب نہیں ہوتا ہے اور روز بروز آن بان اور چمک دمک سے ضوفشانی کرتا رہا ہے۔ دنیا کا آفتاب زمین کی روئیدگی کا باعث ہے اور ہر جاندار کی جان ہے۔ اسی آفتاب کی تمازت قدرے بڑھ جاتی ہے تو جانداروں کو بھسم کر کے رکھتا ہے۔ لیکن آفتاب کی صحافت کا آفتاب ہر روز، ہر وقت اور ہر آن یہاں کے لوگوں کے لئے فرحت بخش ہے''۔

مولانا سعید الدین قادری
صدر انجمن تبلیغ الاسلام شمالی کشمیر

''کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج، اشاعت اور فروغ میں صحافت نے ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل کشمیر میں صحافت کا دوسرا نام

اردو صحافت ہی مراد لیا جاتا تھا لیکن اب چونکہ سرینگر سے نصف درجن سے زائد انگریزی روزنامے منظرِ عام پر آتے ہیں۔ اِس لئے یہاں کی صحافت کو اردو صحافت کہنا اب محلِ نظر ہے، تاہم ابتداء سے لے کر آج تک اردو صحافت نے کشمیر میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت اور اِرتقا میں جو حصہ ادا کیا ہے وہ اپنی ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ آفتاب کشمیر کی اردو صحافت میں ایک اہم ترین سنگ میل بلکہ اہم ترین ستون کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اِس کے بانی مدیر خواجہ ثناء اللہ بٹ صاحب کو جو لوگ کشمیر میں بابائے صحافت قرار دیتے ہیں وہ بلا شک وشبہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں کرتے۔ خواجہ صاحب نے صحافت کا چراغ اُس زمانے میں جلایا، جب اس شعبے میں ظلمت وتاریکی کی تیز وتند ہوائیں چل رہی تھیں۔ بقول کسے ؎

ہم نے ان تند ہواؤں میں جلائے ہیں چراغ
جن ہواؤں نے الٹ دی ہے بساطیں اکثر

تحریر:۔ ڈاکٹر جوہر قدوسی

''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' فِکر امروز، لوگوں کے مسائل، آپ کے خطوط، تو آفتاب کی شان اور ہماری جان ہے۔ علاوہ ازیں سیاسی، سماجی، فلاحی، دینی، طبی، علمی، اصلاحی مضامین اور کھیل کود کی قومی وعالمی خبروں کے لئے آفتاب کی مقبولیت روز بروز عام ہوتی جارہی ہے اور ہماری بھی یہی دعا ہے کہ آفتاب دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر کے کامیابیاں حاصل کرے۔

شفیق احمد بانگی
''جنرل سیکریٹری میڈیکل ایمپلائز فیڈریشن سرینگر''

دانشوروں، مفکروں، ادیبوں اور عوامی سطح کے لوگوں کے درج بالا تاثرات پر مشتمل خطوط ومکاتیب کے اقتباسات سے اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ

بابائے صحافت ثناء اللہ بٹ نے اپنے ہر دلعزیز اخبار کے ذریعہ کون سا اہم رول نبھایا ہے اور کس طرح زندگی کے مختلف شعبوں سے وابستہ عوام الناس کے دِل میں جگہ بنائی تھی۔

شعراء حضرات کس قدر رومنزات کی نگاہ سے خواجہ صاحب کو دیکھتے تھے اور اُن کی حساسِ نگاہیں خواجہ مرحوم کی شخصیت پر کہاں رکتی تھیں۔ اِسی سلسلے میں بطورِ نمونہ سلطان الحق شہیدی کے چند اشعار ملاحظہ کریں ؎

ثناء اللہ بٹ تھے اک مردِ کمال زندہ دل، زندہ نظر، زندہ خیال

واقعی تھے وہ بہت اعلیٰ ظرف ان کی نظریں پڑتی تھیں چاروں طرف

کام آنا دوسروں کے کام تھا دردِ دل کو ملا انعام تھا

وہ تھے نباضِ سیاست اور سماج ہر مرض کا ڈھونڈتے تھے وہ علاج

وہ نوائے تلخ رکھتے تھے مگر راہِ حق پہ چلتے تھے وہ بے خطر

راہبروں کے راہبر تھے لاکلام راہ پر لائے انہوں نے بے لگام

خودنگر، خوددار وخود اندیش تھے باصفا تھے باخدا درویش تھے

...... ☆ ......

حکیم الامت حضرت علامہ اِقبالؒ کے شعر کا دوسرا مصرعہ مستعار لے کر اور اسی کو اپنے اخباری کالم کی سرخی بنا کر خواجہ ثناء اللہ بٹ نے اِس کے تحت سینکڑوں صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین سماجی برائیوں، ظلم وجبر، جہالت وناخواندگی وغیرہ کے بارے میں لکھے اور معاشرہ میں پنپ رہے ناسور کی مرہم کاری کا کام کیا۔ جہاں تک یہ کالم چلتا رہا، لوگ مزے لے لے کر اِس ظرافت آمیز تحریر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور آپس میں اس پر تبصرہ اور رائے زنی کرتے رہتے تھے۔ یہ کالم ہماری صحافتی اور ادبی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حِصہ بن چکا ہے۔ اگر باضابطہ اِس کی تدوین وترتیب کی جائے گی تو یہ ایک کتابی

صورت میں افادۂ عام کے لئے ایک بہترین کوشش ثابت ہوسکتی ہے۔ قارئین کی
تفریح طبع کے لئے مثال کے طور پر مختصراً یہ کالم پیش کئے جاتے ہیں

' خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے '

۷/جون ۱۹۶۸ء

یا تیل مالش ورنہ مسکہ پالش

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے حالیہ اجلاس نئی دہلی میں ملک کی سیاسی پوزیشن سے متعلق پیش کی گئی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کمیٹی کے ایک ممبر مسٹر جگدیش نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ مسٹر جگدیش نے کہا "ہماری سیاست میں اب یہ بات پرانی ہوگئی ہے کہ ہمیں اپنے لیڈروں کی مکھن پالش کس طرح کرنا چاہئے اب تو ہر شخص کے لئے یہ جاننا ضروری ہے اور اس کا ایکسپرٹ ہونا لازمی ہے کہ لیڈر کو، کس وقت، کس سائڈ سے مکھن پالش کرنا چاہئے۔ کتنا مکھن پالش کے لئے استعمال کرنا چاہئے اور اس مکھن پالش کے لئے کس قسم کا مکھن ہونا چاہئے۔ جگدیش صاحب دہلی کی فضاء میں رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی عکاسی کی ہے، انہیں کیا معلوم کہ یہ اپنے آخری حدود کو چھو رہی ہے۔ البتہ اس قدر فرق ضرور ہے کہ جگدیش صاحب تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں اپنا حال دل کھول کر بیان کر سکے، جبکہ میں اپنے گرد و بیش کے متعلق چپ رہنے میں اپنی عافیت سمجھتا ہوں کیونکہ بقول علامہ اقبالؔ۔

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی موجب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

۲،اپریل ۱۹۸۹ء

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا

ڈاکٹر گورو بھی نہ رہے۔ وہ بھی بڑے بلند عزائم کے مالک تھے اور ہمیشہ اپنے سینے میں عزائم کو بیدار رکھتے تھے لیکن بظاہر مسکراتے رہتے تھے۔ اب کہاں وہ

مسکراہٹ جو ڈاکٹر گورو کے ہونٹوں پر پھڑکتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر گورو صاحب دِل کے سرجن تھے اور خود ان کا اپنا دل اپنے مظلوم عوام کے لئے دھڑکتا تھا۔ وہ گرفتار بھی کئے گئے۔ جیل میں بھی رہے، انٹروگیشن کا سامنا بھی کیا۔ پھر بھی اس کے عزائم کسی طرح ملائم نہیں ہوئے اور وہ قائم دائم رہے۔ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں اور ہمارے لئے صرف ان کی یاد باقی رہی، وہ خلوص، مرّوت، شفقت اور محبت کے ساتھ زندہ رہے اور ان کی زندگی۔

خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی اِن کا سفر
زندگانی ان کی تھی مہتاب سے تابندہ تر

ڈاکٹر گورو صاحب کے دوست اور دشمن، حامی اور مخالف، جاننے والے اور بیگانے سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ جیسے سب کو اُن کے ساتھ لگاؤ تھا۔ آج وہ سب اور صورہ کے میڈیکل انسٹی چیوٹ کے در و دیوار اُداس ہیں جیسے ان سب کی متاعِ عزیز لٹ گئی ہو اور آج وہ سب سوگوار ہیں۔ جن کا وہ مفت علاج کرتے تھے جن کو وہ ادویات بھی عطا کرتے تھے اور جو اپنی امیدیں لے کر ڈاکٹر گورو کے پاس جایا کرتے تھے، خدا اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی، خواجہ صاحب کے مزاج کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:۔ خواجہ صاحب تند مزاج تھے اور ان کے مزاج قاتلوں ان کے خیر خواہوں کو اُن سے کبھی کبھار مایوس بھی کر دیتا تھا، معروف اردو شاعر حکیم منظور مرحوم سالہا سال تک ان کے قریبی دُوست تھے۔ ریاستی سرکار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود وہ اخبار ''آفتاب'' میں ایک کالم بھی تحریر کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ بھی ایک مسئلے پر تلخ کلامی ہوئی جو بعد میں مستقل دوری پر منتج ہوگئی۔ لیکن مرحوم حکیم صاحب پھر بھی ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

اسی طرح نظام الدین قریشی صاحب یوں تحریر کرتے ہیں:۔

''ایک دوست، ایک رفیق ایک تندمزاج مخلص انسان جس کی صحبت میری روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔ میرے کنبے کا فرداً فرداً حال واحوال پوچھنا ان کا معمول تھا۔ ایسے میں تلخ وشیریں یادوں کا ذِکر چھیڑنا شاید میرے لئے محال ہو کیونکہ مرحوم اس قدر تاریخ ساز اور قد آور شخصیت اور عظیم صحافی تھے جس کا ذِکر ایک طویل گفتگو کی دلیل بن سکتا ہے''۔

بشارت بشیر لکھتے ہیں

''اُسی کی دہائی کے آغاز میں ادارہ آفتاب میں شامل ہوکر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بابائے صحافت خواجہ ثناء اللہ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسّر آیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک تحریک اور ایک تاریخ تھے۔ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت قلندرانہ پائی تھی، کسی سے مرعوب ہونا تو دور کی بات، بڑے بڑوں کی خبر لے کر اُنہیں اُن کے اوقات یاد دلانے میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ ان کی بے باک اور بے لاگ تحریریں دشتِ صحافت میں قدم رنجہ نئے صحافیوں کے لئے نمونہ عمل ہوں گی، خاک میں پنہاں ہونے والی یہ صورتیں بقائے دوام حاصل کرتی ہیں''۔

''اللہ تعالیٰ مغفرت کرے جرأت، نفاست، فصاحت اور صحافت کے لحاظ سے بالکل منفرد اور بے مثال تھے۔ دوستوں کے دوست اور مخالفوں کے مخالف۔ سمجھوتوں سے بالکل بے بہرہ جو اچھا لگا اس پر قائم رہنا مرحوم کے رگ وپے میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس نے اسے دوسروں سے بالکل الگ اور بے مثال بنادیا تھا''

اسد اللہ میر

خواجہ صاحب انہی خوش نصیبوں میں ایک ہیں جنہوں نے اپنی 55 سالہ صحافتی زندگی میں اپنے پیشے کو ایک معشوق سمجھ کر اپنی سیمابی، انقلابی اور نفسیاتی قلم سے ایسی تلخ وشیرین تحریریں پیش کیں جو عموماً ملت ومعاشرے کے ہر طبقے سے وابستہ افراد کی اندرونی کیفیات اور بیرونی

خدوخال پر مظہر ہوتیں تھیں اور جن کا رنگِ فصاحت کو معاشرے میں جہاں کل کانی مقبولیت اور اعتباریت حاصل رہی وہیں آج بھی حاصل ہے جس کا مجھے بڑا اعتراف ہے، کیونکہ مجھے بھی مرحوم کی صحبت میں چند ایام زانوئے ادب تہہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ معراج حبیب

آفتاب نے کشمیر کی صحافت کو بہت سے سنگ میل طے کرائے ۔اتنے بڑے سائز اور حجم میں اپنے نستعلیق ،خوش خط اور صاف وشفاف گیٹ اپ میں شائع ہونے والا یہ پہلا کشمیری (اُردو) روزنامہ ہے اور اپنی طباعت اور کتابت کے لحاظ سے یہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان کے بہترین روزناموں میں شمار کیا جاتا ہے جو ہر صبح ایک نئی نویلی دلہن کی طرح آراستہ وپیراستہ ہو کر سرینگر کے قارئین کو اپنی صباحت سے محظوظ کرتا ہے۔اسی نے کشمیر کی صحافت میں سب سے پہلے آفسیٹ کی نئی ٹیکنالوجی استعمال کی اور اس کو ایک عظیم انقلاب سے آشنا کر دیا۔اس مرحلے پر بزاز کا ہمدرد کہیں دور غبارِ راہ میں گم ہو جاتا ہے۔آفتاب کی کچھ خبریں اور انکشافات برِصغیر ہی نہیں عالمی پیمانے کے سکوپ بن گئے ۔اِس کے کالم ''پھول اور کانٹے'' صحافتی مزاح کے اچھے نمونے پیش ہوئے ۔کبھی کبھار اس میں ادبی اور تحقیقی مضامین اس پائے کے شائع ہوئے کہ انہیں کشمیر کے کسی علمی تذکرے اور تبصرے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس کا معرکتہ الآرا کالم ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' ایک کلاسک کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔''

محمد یوسف ٹینگ

بالآخر صحافت کی دنیا کا یہ درویش اور قلم وقرطاس کا دھنی قانونِ خداوندی اور قرآن مقدس کی آیت ''کُل نفسٍ ذائقۃ الموت '' کی عملی تفسیر بنتے ہوئے ۲۴ رنومبر ۲۰۰۹ء کو داعیٔ اَجل کو لبیک کہہ گیا اور اپنے پیچھے انمٹ اور سدابہار یادوں کا نقش چھوڑ گیا۔عالمِ تنہائی میں محوِ آرام ہو کر اُس کے سنگِ قبر پر یہ شعر دَرج ہے۔

آسمان میری قبر پر شبنم افشانی کرے
جو بشر میری قبر پر آئے فاتحہ خوانی کرے

..........●●●..........

☆...... پیر عبدالشکور

خواجہ صاحب ایک دبستانِ علم

قدرت کا یہی نظام ہے کہ جو آیا ہے وہ جائے گا، جو زندہ ہے اسے کسی نہ کسی دِن موت کا مزہ چکھنا ہے۔کوئی انسان کسی بھی عہدہ منصب کا ہو، معاشرے میں وہ کسی بھی حیثیت سے دیکھا جاتا ہو یا کسی ذات برادری سے اس کا تعلق ہو، اسے چندروزہ زندگی گذار کر ایک دِن یہاں سے ضرور رخصت ہو جانا ہے۔ یہ سب ہماری نگاہوں کے سامنے آئے دِن ہوتا رہتا ہے۔چار سال قبل بابائے صحافت خواجہ ثناء اللہ بٹ (خواجہ صاحب) نے اپنی زندگی کے ۸۳ سال مکمل کر لینے کے بعد عارضی زندگی سے ابدی زندگی کی طرف سفر کیا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب بھی ہم میں موجود ہیں۔

خواجہ صاحب کو اخبار ''آفتاب'' سے بے انتہا محبت تھی۔انہوں نے صحافت کو ہی اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنایا تھا۔ان کے لئے آفتاب ہی سب کچھ تھا اور وہ آفتاب کے عملے کو اپنا عیال تصور کرتے تھے۔اخبار کو دیدہ زیب، خوب صورت اور قابل رشک بنانے کے لئے وہ ہر وقت کو شاں رہتے تھے۔ ریاکاری اور نمود و نمائش سے انہیں ہمیشہ چڑ تھی۔ان کے کردار کا سب سے متاثر کن وصف ان کی سادگی اور صاف گوئی تھی۔وہ ہمیشہ صاف و پاک اور سادہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ان کی رہنمائی میں اچھے صحافیوں، اخبار نویسوں، قلم کاروں اور نمائندوں کا آبنوں صحافتی میدان میں نظر آرہا ہے لیکن جو چیز خواجہ صاحب کو سب سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کی

شخصیت کی ہمہ گیری ہے۔ انہوں نے ساری زندگی صحافتی مشن کے لئے محنت سے جد و جہد کی اور ایک تابناک مثال قائم کی۔ انہیں روپے پیسے کمانے کی فکر لاحق نہیں تھی۔ اخبار آفتاب کی اشاعت بڑھانے، اس کو جاذب نظر اور پر کشش بنانے کے لئے ہمہ تن مصروف رہے۔ راقم کی خدمات بھی خواجہ صاحب نے اسی مقصد کے لئے حاصل کر لیں۔ لڑکپن سے مجھے آفتاب کے مطالعے کا شوق رہا ہے۔ اخبار آفتاب مستقل قاری ہونے کے سبب اس میں شائع ہو رہے مختلف قلم کاروں کے مضامین پڑھ کر مجھے بھی اسی دیدہ زیب اور کثیر الاشاعت اخبار میں خامہ فرسائی کی تحریک ملی۔ میں ڈاک کے ذریعے اپنے مضامین روانہ کرتا تھا اور یہ مضامین اچھی خاصی جگہ پاتے رہے۔ کئی بار کارٹون بھی بھیجے وہ بھی ترجیحی بنیادوں پر چھپتے تھے۔ خواجہ صاحب اور میرے درمیان غائبانہ تعارف تھا اور روبرو ملاقات سال ۱۹۸۲ء میں اس وقت ہوئی جب انہوں نے اپنے دو ملازمین (بشیر احمد خوش نویس اور دوسرے خواجہ صاحب کے ذاتی ڈرائیور) میرے گھر واقع لال بازار مجھے بلانے کے لئے روانہ کئے اور میں اگلے ہی روز دفتر آفتاب میں حاضر ہوا۔ مجھے خواجہ صاحب کے چہرے پر عجیب سی چمک دکھائی دی اور مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں خواجہ صاحب نے میرے بارے میں پوری جانکاری حاصل کر لی اور اس دوران باتصویر تاریخی کہانیاں تیار کرنے کی بات ہوئی۔ بہر کیف پوری محنت ،تندہی اور جوش و جذبے کے ساتھ میں نے کام کا آغاز کیا۔ یہ تاریخی کہانیاں اور ان ہی کے مطابق قلمی تصویریں روز قسطوں میں شائع ہوتی رہیں۔ پھر ایک روز طے ہوا کہ ''طلسم ہوشربا'' نامی ایک پرانی داستان جس میں تقریباً ۶۰ رفی صد فارسی الفاظ ہیں کو آسان اردو میں لکھ کر باتصویر کہانی شروع کی جائے لیکن ''طلسم ہوشربا'' نامی یہ کتاب کتب فروشوں سے ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ثابت ہوا۔ بہر کیف بڑی مشقت کے بعد اس پرانی کتاب کی چوتھی جلد ایک لائبریری سے دستیاب ہوسکی اور اس کے ایک باب سے میں نے داستان کا آغاز کیا اور اس کہانی کے مطابق قلمی تصویریں تیار کیں۔ یہ داستان ۳ مہینوں تک ''طلسمات کا شہنشاہ افراسیاب آگیا'' کے عنوان کے تحت روزانہ اور متواتر شائع ہوتی رہی۔ پھر ۱۹۸۷ء کے اسمبلی انتخابات قریب

آ گئے اور اس داستان کو بھی میں نے اختتام تک پہنچا دیا۔ اب مجھے فرصت کے لمحات بہت کم میسر تھے اور دفتر آفتاب آنا جانا ناممکن بن گیا۔ ایک دن خواجہ صاحب از خود ہماری دکان واقع مائسمہ بازار تشریف لے آئے۔ انہیں دیکھ کر میں باغ باغ ہوا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ دفتر لے گئے۔ عدیم الفرصت ہونے کے پیش نظر طے ہوا کہ ہر اتوار کو ''سنڈے کے کوفتے'' کے عنوان کے تحت مزاحیہ کالم شروع کیا جائے۔ اس حوالے سے میں نے خوب محنت کی اور ہر اتوار کو یہ مزاحیہ کالم چھپتا رہا جو تقریباً ۳ سال تک لگاتار جاری رہا۔ پھر ملیٹینسی کا آغاز ہوا اور دیگر اخبارات کی طرح روزنامہ آفتاب کا بھی حجم کم ہو کر ۴ صفحات تک رہ گیا۔

خواجہ صاحب بذات خود ایک انجمن تھے جنہوں نے کشمیری عوام کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دی اور انہیں اخبار کے تئیں ذوق وشوق پیدا کیا۔ انہوں نے اخبار آفتاب کی صورت میں کشمیری قوم کو ایک انمول تحفہ دیا۔ ان کا مطالعہ بحر اوقیانوس کی طرح عریض وطویل اور عمیق تھا۔ ان کی یادداشت کی میں داد دیتا ہوں۔ وہ جو بات کہتے تھے کتابوں کے حوالوں سے اور عقلی وفکری دلائل وبراہین کے ساتھ کہتے تھے پھر سونے پہ سہاگہ زبان وادب کی چاشنی اور سلاست ورعنائی، نعت و ادب غرض صحافت میں ا[illegible] قابل رشک بصیرت حاصل تھی۔ جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے تھے۔ وہ اپنی ذات سے دبستانِ علم تھے۔ ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' آفتاب کا مستقل عنوان تھا۔ اس میں مزاح وظرافت کا چٹخارہ ہوتا تھا۔ مزاح وظرافت کا مقصد قارئین کی تفریح طبع اور ہنسانا ہنسانا نہیں بلکہ ایک درس دینا تھا۔ ان چٹکیوں اور گدگدیوں میں خواجہ صاحب بڑے کام کی بات کر جاتے تھے۔ اپنی صحافتی زندگی میں انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی ایک کتاب ''کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک'' سال ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئی۔ کشمیر کی ۳۰ سالہ سیاسی تاریخ پر مشتمل یہ کتاب ہر مکتب فکر نے بے حد پسند کی۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۶ء تک کشمیر میں رونما ہوئے سیاسی اور عسکری واقعات سے بھری خواجہ صاحب کی ایک اور کتاب ''عہد نامہ کشمیر'' چھپ کر آئی۔ اس کے بعد بھی خواجہ صاحب کے قلم کا جادو برابر قائم رہا اور ضعیف العمری اور ناسازی صحت کے باوجود انہوں نے ایک اور کتاب ''کشمیر کی کہانی'' تصنیف کی۔

افسوس کہ آج خواجہ صاحب ہمارے درمیان میں موجود نہیں لیکن وہ ہمارے دلوں میں اس وقت تک رہیں گے جب تک ہم زندہ رہیں اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ وہ ہم سے چار سال قبل بچھڑ گئے لیکن وہ افکار، اپنی خدمات اور اپنی یادوں کا ایک بڑا خزانہ یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ قلم کو یہیں روکتا ہوں اور رب العالمین سے خواجہ صاحب کے لئے دعا کرتا ہوں کہ وہ خواجہ صاحب کو بہترین جزا دے۔

............●●●...... ......

☆......خورشید عالم خان

خواجہ ثناء اللہ بٹ...... شخصیت کے بعض پہلو

خواجہ ثناء اللہ بٹ ۱۴ر نومبر ۱۹۲۲ء کو چھتہ بل سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احمد جو بٹ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے بورڈ سے ۱۹۳۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے برادر محمد سلطان بٹ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے میں جٹ گئے۔ وہ کاروبار میں معاونت کے لئے راولپنڈی گئے جہاں ان کے برادر کشمیری مصنوعات کا کاروبار کرتے تھے۔ کاروبار سے قلبی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے بہتر روزگار کی تلاش میں پہلے لاہور چلے گئے اور پھر وہاں سے ممبئ منتقل ہوئے۔ ممبئ میں کئی برس تک برٹش آرمی کنٹین چلاتے رہے۔ اسی دوران تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا۔ کشمیر واپس لوٹنے کے لئے راولپنڈی پہنچے لیکن راولپنڈی روڈ بند ہو چکی تھی اس لئے مظفرآباد چلے گئے۔ مظفرآباد میں بحالیات آفیسر مقرر ہوئے، جہاں ریاست کے اس حصہ سے لائن آف کنٹرول عبور کر کے اُس پار ہجرت کرنے والوں کی بحالی کے کام میں جٹ گئے۔ عبد الاحد کنٹھ اور میر غلام رسول مہاجروں کی بحالی کے امورات میں ان کے معاون مقرر ہوئے۔ یہ دونوں بعد میں مستقل طور پر وہیں مقیم ہو گئے۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ نے ۱۹۵۳ء میں مظفرآباد سے ہفتہ روزہ "کشمیر" شائع کیا، جو ہمدرد سٹیم پریس راولپنڈی سے طبع ہو کر مظفرآباد سے جاری ہوتا تھا۔ یہ اخبار کشمیر بلاک کا حامی تصور کیا جاتا تھا۔ یہ ایک آزاد خیال اخبار تھا جس کی حکومت مخالف تحریروں سے وہاں کی انتظامیہ کے لئے پریشانیاں پیدا ہوتی تھیں۔ کشمیر بلاک کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت "آزاد کشمیر" کے سیاسی وانتظامی امور کشمیریوں کو سونپ دیئے جانے چاہئیں۔ غلام نبی گلکار، آغا شوکت علی (سرینگر)، غلام رسول،

مولوی نوارلدین، محمد یوسف بچھ، مولوئ عبدالرحیم، خواجہ ثناء اللہ بٹ، ولی محمد عادل، امیرالدین مرازی، عبدالاحد کنٹھ، حبیب اللہ (بانڈی پورہ) اور عبدالخالق انصاری (میر پور) کشمیر بلاک کے سرکردہ ارکان تھے۔ میر واعظ مولانا یوسف شاہ کشمیر بلاک کے سرپرست تھے، یہ حضرات مسئلہ کشمیر کے حوالے سے اکثر و بیشتر ان غیر ملکی وفود سے ملاقات کرتے رہتے تھے، جوان دنوں مظفر آباد کے دورے پر آتے رہتے تھے۔ حکومت ان ملاقاتوں سے خوش نہ تھی۔ انتظامی امورات کے حوالے سے بھی کشمیر بلاک کے ممبران اپنے خدشات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ اسی دوران حکومتِ پاکستان کے دو اعلیٰ آفیسران عزیز الحسن اور اللہ ترین نواز کا نام غبن اور رشوت ستانی میں بار بار آنے لگا۔ ۱۹۵۶ء میں خواجہ ثناء اللہ بٹ، ولی محمد عادل اور امیر الدین مرازی نے ان دونوں کے خلاف بشیر احمد سب جج کی عدالت میں رشوت اور غبن کا مقدمہ دائر کر دیا جو چھ ماہ تک جاری رہا۔ ولی محمد عادل [1] کے مطابق "ہم نے تمام ثبوت و شواہد عدالت میں پیش کئے تھے اور امید کی جارہی تھی کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا"۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ دور شناس، گہری بصیرت کے مالک تھے۔ قومی وملی درد اُن کی رگ رگ میں رچا بسا تھا۔ ان کی چشمِ بینا دیکھ رہی تھی کہ کشمیری قوم کی سیاسی و سماجی اصلاح کیلئے ایک مستحکم و مضبوط ادارے کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ایک ایسے دور میں جب سوچوں پر پہرے بٹھائے گئے تھے اور ترغیب و تحریص کے پرانے آزمودہ نسخوں نے ذہنوں کو مقفل کر دیا تھا، خواجہ صاحب نے دشتِ صحافت کے خارزاروں کی آبلہ پائی کا انتخاب محض جذباتی طور پر نہیں کیا تھا بلکہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ جس ادارے کی بنیاد وہ ڈال رہے ہیں، وہ اقلیم کا چوتھا طبقہ ہونے کے باوجود سب سے زیادہ مستحکم و موثر ادارہ ہے۔

خواجہ صاحب نے جس دور میں "آفتاب" جاری کیا وہ حبس و جمود کا دور تھا۔ صحافت تاریک راہوں میں بھٹک رہی تھی۔ ایک خلا تھا جس کے پُر کرنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔ مولانا مسعودی جیسے جادو نگار اہلِ قلم اس میدان سے دور جا چکے تھے۔ مسلمان، سرکاری نوکریوں کے ایسے گرویدہ تھے کہ کوئی اور راہ انہیں نظر ہی نہ آتی تھی۔ صحافتی حلقوں میں یہ رائے عام

تھی کہ کوئی مسلمان ایک کامیاب صحافی نہیں بن سکتا۔ اس وقت جو تین روزنامے شائع ہوتے تھے ان کے مدیران کشمیری پنڈت تھے۔ خواجہ ثناءاللہ بٹ کی عبقری نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر اس محاذ کا دفاع نہ کیا گیا تو قوم کا مستقبل نہایت مخدوش ہوگا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے چار سو سال پیچھے تھے، مگر سر سید احمد خان نے اس فاصلے کو دوسو سال کم کردیا۔ یہی بات خواجہ صاحب کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے کشمیری مسلمانوں کو اس میدان میں لانے کیلئے بروقت کوشش کی اور ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ آج اگر کشمیر میں صحافتی ادارے اور افراد شان سے اپنا کام انجام دے رہے ہیں تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ پودا، انہی کی لگایا ہوا ہے۔

ہفت روزہ ''آفتاب'' کا پہلا شمارہ جون ۱۹۵۷ء میں سرینگر سے منظرِ عام پر لایا گیا۔ ''آفتاب'' کوکر بازار سیٹھ اسماعیل کی بلڈنگ کے ایک کمرے سے جاری ہوا۔ یہ اخبار کا دفتر بھی تھا اور مدیر کی اقامت گاہ بھی۔ خواجہ ثناءاللہ بٹ کے علاوہ غلام محمد، خواجہ محمد صدیق اور محمد رمضان اخبار کا اوّلین عملہ تھا ہفت روزہ ''آفتاب'' بہت جلد روزنامہ میں تبدیل ہوگیا۔ روزنامہ ''آفتاب'' کا پہلا شمارہ یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو شائع ہوا۔ روزنامہ بننے کی وجوہات کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب کہتے ہیں :

> ''ریاست کی حکمران جماعت نیشنل کانفرنس پھوٹ کا شکار ہوگئی۔ پارٹی کے چار اہم لیڈر خواجہ غلام محمد، صادق، سید میر قاسم، ڈی پی دھر اور پنڈت ترلوچن دت بخشی سے فرنٹ ہوگئے اور انہوں نے ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس (DNC) کے نام سے ایک الگ پارٹی بنالی۔ ڈی این سی نے بخشی کے خلاف اپنی پالیسی اور پروگرام لوگوں تک پہنچانے کیلئے روزنامہ ''کشمیر'' جاری[۱] کیا چونکہ وہ بھی اہم سیاسی اشخاص تھے اور دلّی میں اُن کا بھی اثر ورسوخ تھا۔ لہٰذا بخشی صاحب انہیں اخبار نکالنے سے روک نہیں سکتے تھے۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہ ''کشمیر'' کو واحد روزنامہ بننے سے روک سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مجھے بلا کر روزنامہ

"آفتاب" نکالنے کی ترغیب دی۔ جب روزنامے کے پہلے شمارے کی تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ڈائریکٹر انفارمیشن جانکی ناتھ زتشی میرے پاس آئے اور شمارے کی رسمِ رونمائی بخشی صاحب کے ہاتھوں کروانے کی صلاح دی۔ میں خاموش رہا، شاید وہ اسے میرا اقرار سمجھ بیٹھے تھے گو کہ اس وقت حالات قطعی طور پر ناموافق تھے اور مالی اعتبار سے بھی پریشانیاں تھیں لیکن میں نے سوچا کہ اگر افتتاح بخشی صاحب کے ہاتھوں ہوا تو اخبار پر سرکاری ٹھپہ لگ جائے گا، عوام میں اس کی کیا قدرو قیمت رہے گی؟ لہٰذا میں نے کسی کو خبر کئے بغیر چپکے سے روزنامہ "آفتاب" کا پہلا شمارہ مارکیٹ میں جاری کردیا"۔[۴]

"آفتاب" کے لئے ابتدائی ایام نہایت کٹھن اور مشکلات سے بھرپور تھے۔ مالی وسائل کی کمی کے علاوہ سب سے بڑی آزمائش یہ تھی کہ اخبار بینی کا شوق کلیتاً مفقود تھا۔ وادی میں اس وقت صحافتی مزاج ناپید تھا۔ حکومت کی تنقید بغاوت تصوّر کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہفت روزہ "آفتاب" کا پہلا شمارہ تیار ہو کر مرکنٹائل پریس میں چھپنے کے لئے پہنچا تو پریس کے مالک نرنجن ناتھ نے اخبار کے مندرجات کا مطالعہ کرنے کے بعد اخبار چھاپنے سے انکار کردیا اور کہا "یہ اخبار نہیں بغاوت ہے"۔

روزنامہ "آفتاب" شروع میں دیگر اخبارات کی طرح لتھو پر چھپتا تھا۔ جب "آفتاب" کی اشاعت زیادہ ہوگئی تو لتھو پریس مالک نے پانچ سو سے زیادہ کاپیاں چھاپنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ وہ دَور تھا جب "آفتاب" سخت مالی مشکلات سے دوچار تھا۔ خواجہ ثناء اللہ بٹ نے مالی مشکلات کے باوجود آفسیٹ پرنٹنگ پریس لگانے کے لئے کوششیں تیز کردیں تاکہ اخبار کو دیدہ زیب بنانے کے علاوہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھاپا جاسکے۔ خواجہ صاحب کے ایک رشتہ دار حاجی محمد جمال نے اس مشکل وقت میں "آفتاب" کو پانچ ہزار روپے قرض دیئے تاکہ آفسیٹ مشین دہلی سے منگائی جاسکے چنانچہ "آفتاب" ۱۹۷۱ء میں فوٹو آفسیٹ پر چھپنا شروع ہوا۔ لیتھو چھپائی سے آفسیٹ پرنٹنگ کشمیر کی صحافت میں ایک اہم پیش رفت تھی۔ آفسیٹ پرنٹنگ کے آغاز کے ساتھ ہی

کشمیر کی صحافت میں فوٹو جرنلزم کی بھی بنیاد پڑی۔ محمد امین آفتاب کے پہلے فوٹو جرنلسٹ ہیں۔ جنہوں نے خواجہ ثناء اللہ بٹ کی فرمائش پر ایک تصویر ''آفتاب'' میں شائع کرنے کے لئے پیش کی تھی۔ خواجہ صاحب نے تصویر پر اپنے ہاتھ سے فوٹو آفتاب/محمد امین لکھا۔ محمد امین اور ''آفتاب'' کی رفاقت کا یہ سلسلہ ۱۷ برس تک قائم رہا۔ آفتاب کے دوسرے فوٹو جرنلسٹ حبیب نقاش تھے۔

خواجہ صاحب ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے۔ لیکن ماضی کے تجربات سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ حکومت اور انتظامی اداروں سے اختلافات کو ہوا دینا حصولِ مقصد میں سدِ راہ بن جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے صبر اور ہمت کا دامن نہیں چھوڑا۔ جب آفتاب جاری ہوا اس وقت بخشی پرستی نصف النہار پر تھی لیکن اس کے باوجود خواجہ صاحب نے اخبار کو ان کی تنظیم نیشنل کانفرنس کا آفیشل آرگن نہیں بنایا۔ انہوں نے روزنامہ آفتاب کی رسمِ رونمائی کی تقریب محض اس لئے منعقد نہیں کی کہ بخشی صاحب نے اس میں شرکت کر کے اپنے ہاتھوں رسم رونمائی کی پیشکش کی تھی۔ اگرچہ آفتاب بخشی دورِ حکومت میں کوئی منفرد مقام حاصل نہ کرسکا لیکن جوں ہی ان کا اقتدار ختم ہوا اخبار نے بھی ورق الٹا اور ایک بھرپور اخبار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا۔ موئے مقدس تحریک کے دوران آفتاب کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ آفتاب میں کشمیریوں کے دل دھڑکنے لگے۔ پرمیشوری ایجی ٹیشن کے دوران خبر کا صحیح رخ جاننے کیلئے لوگ اسی اخبار کا مطالعہ کرتے تھے۔ ستر اور اسی کی دہائی میں آفتاب اپنی مقبولیت کے عروج پر تھا۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ کا سب سے پہلا عشق صحافت تھا جس کے لئے انہوں نے بیش بہا قربانیاں دیں حتیٰ کہ ملازمت اور اعلیٰ عہدوں کی پیش کش بھی ان کے اس جذبہ صادق کو سرد نہ کرسکی۔ راستے کی رکاوٹوں اور مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آخری سانس تک مردانہ وار، کسی صلے کی تمنا یا ستائش کی پرواہ کئے بغیر عزم راسخ اور شوقِ کامل وسعی پیہم سے سرتاپالیس، اپنے خونِ جگر سے اس اخبار کو سینچتے رہے۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے مدیرِ آفتاب تاریخِ کشمیر کے واقف کار بھی تھے اور عینی گواہ بھی۔ انہوں نے تاریخِ کشمیر کے کئی ہنگامہ خیز دور دیکھے تھے۔ قلم وقرطاس کا ساتھ نبھاتے

ہوئے زمانے کے سرد و گرم کا احاطہ کیا، تاریخ کے نشیب و فراز کا مشاہدہ کیا، قوم کاشمیر کو جن کھلونوں اور بھول بھلیوں سے بہلایا گیا ان کی ٹوٹ پھوٹ کے مناظر دیکھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور تاریخی شعور گہرا تھا۔ وہ قومی مزاج کے رمز شناس تھے اور اُن کی دیدہ و بینا پر یہ حقیقت بھی عیاں تھی کہ کس کس طرح اہلِ وطن کے جذباتی استحصال کے لئے گمراہ کن نعروں کا سہارا لیا گیا۔ وہ بیشتر سیاسی رہنماؤں سے بدظن اور متنفر تھے کیونکہ ہمعصر تاریخ کا عینی شاہد ہونے کی حیثیت سے وہ جانتے تھے کہ اُن کے یہاں نااتفاقی، سر پھٹول، رسہ کشی، بے عملی، مفاد پرستی اور ہوسِ اقتدار کے سواء اور کوئی چیز مشترک نہیں تھی۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ ایک جہاں دیدہ، نڈر، بے باک، تجربہ کار، وسیع مطالعہ اور پختہ ذہن کے مالک بزرگ صحافی تھے۔ انہیں کشمیر کی ''تحریکِ آزادی'' کے صفِ اوّل کے تمام رہنماؤں کا قرب حاصل رہا تھا۔ حکمراں اور حزبِ مخالف سیاسی حالات پر ان کی رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُن کی چشمِ بینا نے حد متارکہ کے دونوں اطرف جن سیاسی واقعات کا مشاہدہ کیا، اُنہیں قوم تک پہنچانا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے پہلے ''کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک'' اور پھر ''عہد نامہ کشمیر'' جیسی دو اہم کتابیں تصنیف کیں۔ اس کتاب میں کشمیر کی سیاسی تاریخ کے علاوہ تمدّنی اور عسکری حالات کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے اور مسلم کانفرنس کے قیام سے لے کر سانحہ چرار شریف تک کے اہم واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ''کشمیر کی کہانی'' ان کی تیسری تصنیف ہے جس میں کشمیر کے نامساعد حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خواجہ صاحب نے اپنے اخبار کو کسی بھی برسرِ اقتدار یا حزبِ مخالف سیاسی جماعت کا ترجمان نہیں بنایا۔ بخشی غلام محمد نے خواجہ صاحب کو پیشکش کی تھی کہ وہ ''آفتاب'' کو نیشنل کانفرنس کا آفیشل آرگن بنائیں۔ سرکردہ صحافی رشید تاثیر کا ماننا ہے کہ ''آفتاب'' اپنے آغاز سے ہی غیر جانبدارانہ پالیسی پر گامزن رہا اور جب اخبار میں بخشی انتظامیہ پر انگشت نمائی ہونے لگی تو بخشی غلام محمد نے تحمل لیکن دھمکی آمیز لہجہ میں ایڈیٹر ''مارتنڈ'' بدری ناتھ سے کہا ''اگر میں نے آفتاب'' پر کوئی عنایت نہیں کی مگر اس کی راہ میں روڑے بھی نہیں اٹکائے۔

اس کو میرے خلاف لکھنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے"۔ [5] "آفتاب" بخشی صاحب کی اس حمایت کے اعتراف کے باوجود شیخ محمد عبداللہ اور محاذ رائے شماری کا حمایتی رہا۔ "آفتاب" اور غلام محمد صادق کی حکومت کے تعلقات خوشگوار رہے۔ ۱۹۶۷ء میں پرمیشوری ایجی ٹیشن نے ہنگامہ کی صورت اختیار کرلی۔ چھ اخبارات پر ۷ ر اکتوبر ۱۹۶۷ء کو دو دو ماہ کی پابندی عائد کردی۔ اس دوران پنڈت ایکشن کمیٹی نے روزنامہ "آفتاب" پر بھی پابندی کا مطالبہ کیا۔ پنڈت ایکشن کمیٹی نے اس وقت کے وزیر داخلہ وائی بی چوان سے "آفتاب" پر پابندی عائد کرنے کی سفارش کرنے کے لئے زور ڈالا لیکن صادق صاحب نے کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر "آفتاب" پر پابندی عائد کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پرمیشوری ایجی ٹیشن کے دوران قومی میڈیا اور سرینگر میں قومی اخبارات کے نمائندوں نے رشید تاثیر کے الفاظ میں "غلام محمد صادق کے سیکولر کردار کو پرمیشوری کے عشق کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھایا"۔ صادق صاحب کو اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ نیشنل پریس فرقہ پرستوں کی تحویل میں ہے۔ وہ کشمیر کے بارے میں خاص قسم کی تنگ نظری کا شکار ہے اور فرقہ وارانہ ماحول کے دائرہ میں رہ کر کشمیر سے متعلق تصوراتی نظریہ کے مطابق خبریں گھڑنے پر یقین رکھتا ہے۔ روزنامہ "آفتاب" ایکارڈ سے قبل شیخ صاحب کا زبردست حمایتی تھا۔ حتیٰ کہ دہلی کے انگریزی اخبارات "آفتاب" کا حوالہ دیتے وقت "عبداللہ نواز روزنامہ آفتاب" اور "رائے شماری نواز روزنامہ" لکھنے سے بھی نہیں کتراتے تھے۔

خواجہ ثناءاللہ بٹ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ وہ ہیروں کی تراش خراش کے فن سے خوب واقف تھے۔ وہ ایک جوہری تھے جنہیں ہیروں کی خوب پہچان تھی۔ آفتاب سے وابستہ کارکن صحافیوں کو صدف سے گہر بنانے میں ان کی ریاضت کے سبھی معترف ہیں۔ ریاست کے سیاسی، انتظامی، تعلیمی اور صحافتی حلقوں میں خواجہ صاحب کے تربیت یافتہ افراد کی موجودگی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ مردم شناس اور مردم ساز شخصیت تھے۔ وہ خود بھی محنتی تھے اور دوسروں کو بھی اسی راہ پر چلانا چاہتے تھے۔

خواجہ صاحب نہایت خوددار شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے راستے خود ہی

متعین کئے تھے۔ زندگی گزارنے کا ان کا اپنا نظریہ تھا جہاں دوسروں کا عمل دخل بہت کم تھا۔ وہ کسی سے ہرگز مرعوب نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کی شخصیت دوسروں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ ان کے اپنے اصول تھے جن سے انحراف نہایت مشکل تھا۔ وہ کبھی بھی سیاسی لیڈروں یا سرکاری افسران کے دروازوں پر دستک نہیں دیتے تھے بلکہ قدآور شخصیات ان کے دفتر، جو ان کی اقامت گاہ بھی تھی، پر حاضر ہو کر انہیں سلام کرتے تھے اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ بھی لیتے تھے۔

آفتاب سے وقتاً فوقتاً کئی باصلاحیت صحیفہ نگار وابستہ ہوئے لیکن کچھ مدت کے بعد اخبار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ان صحافیوں کی آفتاب سے علیحدگی میں خواجہ صاحب کی انانیت کا کہیں نہ کہیں عمل دخل رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جاسکتا کہ وہ دوسروں کی صلاحیتوں سے گھبرا جاتے تھے یا دوسروں کو برداشت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا ضمیر نار و نور کا مجموعہ تھا۔ موافق اور ناموافق حالات میں وہ اپنی وضع اور خو پر قائم رہے۔ فیصلہ لیتے وقت وہ ہرگز اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ان کے فیصلوں سے دوسروں کے جذبات کس قدر مجروح ہوں گے۔ نوجوان اور باصلاحیت صحافیوں کا آفتاب سے چلا جانا کوئی خوشگوار مرحلہ نہیں تھا۔ اس کا خمیازہ آفتاب کو بھی بھگتنا پڑا۔ اس کا احساس خواجہ صاحب کو بھی ہو چکا تھا۔ انہوں نے اس امر کا بجا طور پر شکوہ بھی کیا تھا کہ جو صحافی آفتاب سے چلے گئے انہوں نے پھر کبھی پلٹ کر اس جانب نہیں دیکھا۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ صحافتی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ سماجی بدعات کے خلاف انہوں نے زوردار مہم شروع کی۔ انہوں نے سماج سدھار کمیٹی کی بنیاد ڈالی جس کے دیگر ممبران محمد شفیع پنڈت، اعجاز احمد ککرو اور ڈاکٹر علاقہ بند تھے۔ انہوں نے قوم کو سادہ اور پاک وصاف زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم کا سرمایہ کشمیری قوم کی صحت، تعلیم اور سماجی کاموں میں خرچ ہو۔

خواجہ صاحب نے ۱۹۷۸ء میں آفتاب چیریٹبل ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا۔ اس ٹرسٹ کے پہلے چیرمین حاجی محمد جمال تھے۔ ٹرسٹ کے قیام کے پس پردہ جہاں روزنامہ ''آفتاب'' کا مستقبل تھا وہیں خواجہ صاحب آفتاب کی کمائی میں غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کو بھی شریک بنانا چاہتے تھے۔

خواجہ ثناء اللہ بٹ کی ازدواجی زندگی کامیاب نہیں رہی جو طلاق پر منتج ہوئی۔اس کے بعد انہوں نے اپنا سارا وقت آفتاب کے لئے وقف کردیا تھا۔وہ تنہا رہتے تھے۔اس تنہائی میں ان کے رفقاء شیخ عبدالرحیم اور خواجہ محمد صدیق ان کی خبر گیری میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔محمد سبحان ماگرے اور فاروق احمد نے دل وجان سے ان کی خدمت کی۔خواجہ صاحب نہایت خوددار تھے۔انہوں نے وفات سے قبل اپنی زمین خادموں کے نام وقف کر کے خدمت کا صلہ ادا کردیا تھا۔

خواجہ صاحب زندگی کے آخری ایام میں بیمار ہوگئے تھے۔انہیں علاج کی غرض سے شیر کشمیر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ صورہ داخل کیا گیا تھا جہاں ۲۴/نومبر ۲۰۰۹ء کو ان کا انتقال ہوا۔ان کی نماز جنازہ 25 نومبر کو تاریخی لال چوک میں ادا کی گئی جس میں ریاست کے سرکردہ سیاست دانوں، ادیبوں، شعراء، مفکروں اور دانشوروں کے علاوہ لوگوں کی جمِ غفیر نے شرکت کی۔خواجہ صاحب کے سانحہ ارتحال سے کشمیر میں اردو صحافت کے ایک یادگار دور کا خاتمہ ہوا۔

حاشیہ

۱: ولی محمد عادل سوپور کے ایک معروف سیاسی وسماجی کارکن ہیں۔خواجہ ثناء اللہ بٹ، امیر الدین مرازی اور وہ ایک ساتھ سرحد کے اس طرف واپس بھیج دیئے گئے تھے۔

۲: ہفت روزہ کشمیر عظمیٰ۔نصف صدی کا گواہ ''آفتاب'' ۲۷/اگست ۲۰۰۶ء

۳: ہفت روزہ کشمیر 14 نومبر 1954ء کو موتی لال مصری کی ادارت میں کمیونسٹ پارٹی نے سرینگر سے جاری کیا۔ڈیموکریٹک نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد ڈی پی در کی ادارت میں اس جماعت کا آفیشل آرگن بنا۔DNC کا خاتمہ ہونے کے ساتھ ہی اخبار بھی بند ہو گیا۔

۴: ہفت روزہ کشمیر عظمیٰ۔نصف صدی کا گواہ ''آفتاب'' ۲۷/اگست ۲۰۰۶ء

۵: نقوشِ صحافت ص:۲۰۹

............●●●............

☆...... سلیم سالک

آفتاب کی ادبی خدمات

کشمیر قدیم زمانے سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ تہذیب وتمدّن ہو یا زبان وادب یا پھر سیاست وتجارت، ہر معاملے میں کشمیری وسیع الذہن اور فراخ دل رہا ہے۔ جہاں تک ریاستِ جموں وکشمیر سے اردو زبان وادب کے تعلق کی بات ہے تو آئینی طور پر اردو ہماری سرکاری زبان تسلیم کی گئی ہے۔ ڈوگرہ شخصی دَور سے ہی اس زبان کو رابطہ کی زبان کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ کیونکہ ڈوگرہ عہد میں پہلی مرتبہ جموں کے ان علاقوں کو سرکاری طور پر کشمیر کے ساتھ جوڑ دیا گیا جہاں ڈوگری بولی جاتی تھی۔ چنانچہ اسی انتظامی ضرورت کے پیشِ نظر ١٨٨٩ء میں اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ڈوگرہ عہد میں بیوروکریسی کے لئے بیرونِ ریاست کے جن افسران کو منتخب کیا گیا ان میں بیشتر اردو زبان کے مشہور نام تھے۔ چنانچہ اسی دور میں یہاں اردو وشعروادب کی محفلوں کا آغاز ہوا اور اس طرح یہاں مقامی شاعروں اور ادیبوں کا ایک حلقہ وجود میں آیا۔ جن میں ہرگوپال خستہ، خوشی محمد ناظرؔ، سالگرام سالک، محمد دین فوقؔ، محمد عمر نورالٰہی، اللہ رکھا ساغرؔ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کے دامن کو وسعت عطا کی۔ اس طرح ریاست میں اردو ادب کی کونپلیں انیسویں صدی میں ہی پھوٹنے لگیں۔ اخبارات اور رسائل کی عدمِ دستیابی کی وجہ سے یہاں کے ادباء وشعرا کی نگارشات لاہور اور پنجاب کے رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ جوں ہی لالہ ملک راج صراف نے ١٩٢٤ء میں ''رنبیر'' جاری کیا، تو ریاست میں ہر طرف اخبارات نکلنے شروع ہو گئے، جو یہاں کے ادیبوں کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔

کشمیر میں اردو ادب کی ترقی و ترویج میں مقامی اخباروں نے ایک خاص رول ادا کیا ہے یہاں کی نئی پود کی آبیاری کرنے اور ان کو ایک راہ گزر عطا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا سرسری جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہونے والے اخبارات پر ایک نظر دوڑائی جائے تاکہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اگرچہ کچھ اخبارات ابتداء سے ہی اِکا دکا ادبی تحریریں شائع کرتے رہے ہیں لیکن پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں نکلنے والا اخبار ''ہمدرد'' پہلا اخبار ہے جس میں باقاعدہ ادبی نگارشات کو جگہ دی گئی۔ یہاں تک کی ادبی ایڈیشن بھی نکالے گئے۔ بقول برج پریمی

> ''ہمدرد کے ادبی ایڈیشن سے دو فائدے ہوئے۔ اولاً یہ کہ کشمیر میں اردو کی ترویج و اشاعت میں اضافہ ہوا اور دوئم یہ کہ یہاں بھی لوگوں کو تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کا موقعہ ملا اور بعض ایسے قلمکار نمودار ہوئے جن کے قلم کی توانائیوں نے بعد میں ہندوپاک میں دھاک جمادی''۔

''ہمدرد'' کی خدمات کا اعتراف محمد علی جناح ان الفاظ میں کرتے ہیں ''میں ہمدرد کو ٹائمز لندن کی قبیل کا اخبار سمجھتا ہوں'' اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمدرد کا کیا معیار رہا ہوگا۔ ہمدرد کی اس روایت کو بعد میں ''خدمت'' نے بھی برقرار رکھا۔ مولانا محمد سعید مسعودی اور غلام احمد کشفی کی کاوشوں سے وادی کے ادباء و شعراء بڑی باقاعدگی کے ساتھ سے ''خدمت'' کے لئے لکھنے لگے۔ ''خدمت'' کی ادارت سے ہمیشہ صاحبِ قلم حضرات وابستہ رہے ہیں۔ جن میں رحمان راہیؔ، مکھن لال محوؔ، خواجہ غلام رسول ریزؔ اور پنڈت نندلال واتلؔ قابلِ ذکر ہیں۔ بقول پروفیسر عبدالقادر سروریؔ ''ادبی خدمات میں واتلؔ سنجیدہ فکر، معتدل اندازِ نظر کے حامل اہل صحافت میں سے ہیں''۔ خدمت کے ساتھ ساتھ ''مارتنڈ'' نے بھی ادبی ماحول بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ یہاں تک کہ ریاست کے پہلے افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کی تخلیقات زیادہ ''مارتنڈ'' میں شائع ہوتیں تھیں۔ اس طرح یہاں کے ادیبوں کو ابتداء میں ہی اخباروں کے وسیلہ سے اپنی ادبی نگارشات دوسروں تک پہنچانے کا موقعہ میسّر ہوا۔

۱۹۴۷ء کے سانحہ تقسیم سے کشمیر کے حالات بھی دگرگوں ہوگئے۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول پیدا ہوگیا۔ سیاسی اور سماجی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اخبارات پر بھی منفی اثرات ثبت ہوئے۔ کچھ اخبارات وقتی طور بند ہوگئے اور کچھ حالات کی نامساعدت کی نذر ہوگئے۔ اس دَور میں جو جیالے میدان صحافت میں اتر آئے، ان میں خواجہ ثناء اللہ بٹ سرفہرست ہیں۔ خواجہ ثناءاللہ بٹ نے جنوری ۱۹۵۸ء میں ہفتہ روزہ ''آفتاب'' نکالنا شروع کیا۔ اگرچہ خواجہ صاحب کے لئے یہ نیا میدان نہیں تھا، کیونکہ انہوں نے ۱۹۵۲ء میں مظفرآباد سے ہفتہ روزہ ''کشمیر'' جاری کیا تھا لیکن بے باک رویہ اختیار کرنے پر ان کو وہاں سے پُش بیک کر کے کشمیر بھیج دیا گیا۔ خواجہ صاحب کی کوششوں سے ہفتہ روزہ ''آفتاب'' چند مہینوں میں ہی روزنامہ کی شکل میں نکلنے لگا جو آج بھی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ابتداء سے ہی کشمیر کے اطراف واکناف کی سماجی اور سیاسی ترجیحات کو مدِ نظر رکھا جس سے اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ''آفتاب'' عوام کی دل کی دھڑکن بن گیا۔

خواجہ صاحب خود ایک صاحبِ طرز صحافی تھا۔ علم وادب سے گہرا تعلق تھا۔ سیاسیات و سماجیات کے ساتھ ساتھ ادبیات سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے۔ خصوصاً علامہ اقبالؔ سے قلبی مناسبت رکھتے تھے۔ اسی لئے اپنے ادارتی کالم کے سرنامے کے طور پر علامہ اقبالؔ کا یہ شعر ہمیشہ لکھتے تھے۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

اس کے علاوہ اپنے فکاہیہ کالم ''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے'' کا عنوان بھی علامہ کے شعر سے ہی مستعار لیا تھا۔ اس کالم میں زبان کی چاشنی اور موضوع کی تازگی قاری کو آخر تک گرفت میں رکھتی تھی۔ خواجہ صاحب کی ابتداء سے ہی یہ کوشش رہی ہے کہ نئی نسل کو لکھنے کی طرف راغب کیا جائے۔ اس لئے انہوں نے باقاعدہ ادبی نگارشات کو جگہ دی۔ چونکہ کشمیر کے ساتھ ہمیشہ سے یہ بدقسمتی رہی ہے کہ یہاں باقاعدگی کے ساتھ کوئی رسالہ نہیں نکلا اگرچہ سرکاری طور پر

کلچرل اکادمی کا ''شیرازہ'' اور محکمہ اطلاعات کا ''تعمیر'' شائع ہوتے ہے لیکن ان میں ادباء بہت کم شعراء جگہ پاتے تھے۔ باقی نئے لکھنے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ اس دور میں نوعمر ادیبوں کی حالت زار کیا تھی، اس کی عکاسی ڈاکٹر بشیر گاش کے مرتب کردہ افسانوی انتخاب ''ارمغانِ کاشمیر'' ، جواُن ادیبوں کی نگارشات کا مجموعہ ہے جن کی پذیرائی کے لئے زبان وادب کے بڑے ایوان، فورم اور اکیڈمیاں تیار نہیں ہوتی تھیں، کے دیباچے کے اس اقتباس سے ہوتی ہے۔

''جوہریوں کی اس وادی میں بھی کوئی کمی نہیں، لیکن یہ لوگ وہی ہیرے خریدتے ہیں جن پر محنت نہیں کرنا پڑتی۔ اب کون ٹیڑھے میڑھے پتھر کے ٹکڑے خریدے، ان کی تراش خراش میں وقت اور طاقت ضائع کرے، انہیں چمکائے اور دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اس لئے یہ خام ہیرے کباڑیوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں اور کبھی جب نیلام بھی کردیئے جاتے ہیں تو بولی پندرہ روپے سے اوپر کبھی نہیں جاتی۔ اس کباڑ خانے کی کئی شاخیں ہیں۔ مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ اس کباڑی بازار کے واحد جوہری ہے جو ناتراشیدہ ہیرے قبول کرتا ہے، انہیں جلا بخشتا ہے مگر پھر انہیں منڈی میں پھینک کر یہ بھول جاتا ہے کہ آگے ردی خریدنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے جو پرانے، استعمال شدہ اور بوسیدہ مال کی تجارت کرتے ہیں۔ اس مجموعے (ارمغانِ کاشمیر) کے تمام شرکاء ''آفتاب'' کے ذریعہ ہی میدانِ ادب میں داخل ہوئے تھے اور اگر ہماری بزم میں سے کسی نے نام بھی پیدا کیا تو تاریخ اس ادب ساز کو یاد کرے گی لیکن وہ بھی اپنے اور نوجوان ادباء کے درمیان ایک ''محترم فاصلہ'' رکھتے ہیں جو بعض اوقات ایک ایسی خلیج بن جاتی ہے جسے پاٹنا بہت ہی مشکل ہوجاتا ہے''۔

خواجہ صاحب نے ''آفتاب'' کے ذریعہ نئے لکھنے والوں کو ایک پلیٹ فارم فراہم کیا، جس سے نوخیز ادیبوں کی ایک بڑی کھیپ سامنے آئی۔ یہ دَور اس حوالے سے زرخیز تھا کہ لکھنے والوں نے نئے رجحانات اور نئے میلانات کے تحت اپنی تخلیقی پیاس بجھانی شروع کردی تھی۔ یہاں

کے ادبی ماحول میں گہما گہمی پیدا ہو گئی تھی۔ آفتاب کے ادبی صفحات ادیبوں کے لئے روح افزاء سے کم نہ تھے۔ جن ادیبوں نے باقاعدہ آفتاب کی درسگاہ سے ہی اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی ان میں چند کا تعارف کرانا اس لئے مقصود ہے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ آفتاب کے صفحات کس طرح ایک نسل کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

عمر مجید کی پہلی کہانی "ایک بوڑھا ولر کے کنارے" آفتاب میں جون ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ پہلی کہانی پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ عمر مجید کی پہلی کہانی ہے۔ الفاظ کی دروبست اور موضوع کا تنوع اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عمر مجید منفرد افسانہ نگار ہے۔ آپ کی اکثر و بیشتر کہانیاں آفتاب کی زینت بنی ہیں جن میں 'سمجھوتا' ادھورا تاج محل، سیزن، انتظار کے قیدی، سڑک کا آدمی" وغیرہ قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ "یہ بستی یہ لوگ" ۱۹۷۰ء اور درد کا دریا" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔ بشیر گاش پیشہ کے اعتبار سے ایک معالج ہیں لیکن ادب سے گہرا تعلق ہے۔ آفتاب میں پہلی کہانی "رقصِ شرر" شائع ہوئی۔ خود گاش کہتے ہیں کہ "خواجہ صاحب نے میرے پہلے ہی افسانے "رقصِ شرر" کو دیکھ کر پیشن گوئی کی تھی کہ اگر تم سچے دل سے اور لگن کے ساتھ ادب برائے زندگی کو اپنا لو تو جلد ہی اچھا لکھنے والوں میں شمار کئے جاؤ گے"۔ گاش صاحب "آفتاب" کے ہیلتھ سیکشن کے انچارج بھی رہے ہیں۔ انہوں نے "ارمغانِ کاشمیر" کے نام سے افسانوی مجموعہ ترتیب دیا، جس میں وادی کے وہ افسانہ نگار شامل ہیں جنہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز "آفتاب" سے ہی کیا ہے۔ گاش صاحب منجھے ہوئے نثر نگار ہونے کے علاوہ شاعر بھی ہیں۔

سانسوں کی ڈور کٹ گئی منزل بھی ہے قریب
ٹوٹے گی کہاں دیکھئے امید کی زنجیر

ایس۔ ایم قمر کی پہلی کہانی "شاہراہ کی دھول" ۱۹۶۶ء میں آفتاب کی زینت بنی۔ پہلی ہی کہانی میں رومانیت سے انحراف کرتے ہوئے بھوک، افلاس اور گھٹن کا احساس دلانے لگے۔ قمر کو خضر مغربی کے زیرِ تربیت بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ابتداء سے ہی عمر مجید کے ساتھ کہانیاں لکھنے کا

جنوں سوار ہوا۔ افسانوں کا ایک مجموعہ ''جلتے چنار'' کے عنوان سے ترتیب دیا تھا لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر آج تک شائع نہ کر سکے۔ آفتاب میں کئی سال تک متواتر افسانے لکھتے رہے۔ ان کی عمدہ کہانیوں میں ''ساحل دور ہے''، ''خودکشی''، ''کالا دل''، ''آگ'' ''تیسرا پتھر'' اور ''جھیل کے سائے'' قابلِ ذکر ہیں۔

م۔م۔صدیق کی پہلی کہانی ''دیوار'' ۱۹۷۰ء میں آفتاب میں شائع ہوئی۔ گھر میں زبان وادب کا ماحول نہ ہونے کے باوجود شعر وسخن کی محفلیں آباد کرتے رہے۔ اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ نام نہاد سرکردہ ادیب اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ رضیہ تبسم کے ساتھ افسانوں کا ایک مجموعہ ''احساس کے گھاؤ'' عنوان سے شائع کیا جس میں کل سترہ افسانے ہیں۔ صدیق کے افسانوں میں زندگی کے گوناگوں مسائل کی عکاسی بڑی فنکاری سے ملتی ہے۔ ان افسانوں میں ''مانگے کا اجالا''، ''واپسی'' اور ''پلِ صراط کے راہی'' عمدہ افسانے ہیں۔ صدیق نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو افسانوں تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ ''ننگا سر ننگے لوگ'' کے عنوان سے ایک ناول بھی لکھا، جو ابھی تک اشاعت کے مرحلے سے نہیں گزرا۔

نذیر مشتاق کی پہلی کہانی بعنوان ''بدنصیب'' آفتاب میں شائع ہوئی۔ مشتاق صاحب نے طب کا طالب علم ہونے کے باوجود بہت اچھے افسانے لکھے، جو زبان وبیان کے اعتبار سے کسی طرح کمزور نہیں تھے۔ ان کے افسانوں میں ''مصیبت''، ''دھماکہ''، ''قاتل کون؟''، ''ماں کی بددُعا'' اور ''آج کا رانجھا'' قابلِ ذکر ہیں۔ افسانوں کے ساتھ ساتھ کئی ناول بھی لکھے لیکن سوائے ''پیغام'' کے کوئی ناول شائع نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ ٹی۔وی، ریڈیو اور سٹیج کے لئے معیاری ڈرامے لکھے۔ ایران میں کئی سال رہنے سے زبان وبیان میں انفرادیت جھلکتی ہے جس کی عمدہ مثال کشمیر عظمیٰ کے ہیلتھ کالم ''فکرِ صحت'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

شمس الدین شمیم کی کہانی ''باون گز کے دیوتا'' آفتاب میں ہی شائع ہوئی۔ شمیم نے اپنے افسانوں میں رومانیت سے ہٹ کر حقیقی زندگی کو پیش کرنے کی سعی کی۔ ان کی کہانیوں میں ''مسلسل سفر، میزان، سڑک، ایک ٹانگ کا کھلونا'' قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے ''ویرانے'' کے

عنوان سے ۱۹۷۴ء میں ایک افسانوی مجموعہ شائع کیا۔ شمیم نے کئی سال "آفتاب" میں بحیثیت معاون مدیر کام کیا۔ آفتاب کے ادبی ایڈیشن، خواتین ایڈیشن اور فلم ایڈیشن میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں جھلکتی تھیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور دوردرشن کے لئے درجنوں ڈرامے لکھے۔

خالد بشیر احمد نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز افسانوں سے کیا۔ ان کی پہلی کہانی "انوکھا ملن" ۱۹۷۲ء میں آفتاب میں شائع ہوئی۔ ان کے افسانوں میں "اور ہم ہی بن گئے" خونی وادی سے واپسی" قابلِ ذکر ہیں۔ شعری میلان کے غلبے نے افسانوی میدان سے شاعری کی راہ دکھائی اور "صدائے نیم شب" اور "خواب پارہ" کے نام سے دو خوبصورت مجموعہ کلام شائع کئے۔ محکمہ اطلاعات کے ماہانہ رسالے "تعمیر" کی ادارت کئی سال تک انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ جہلم کی تاریخی، تمدنی اور ماحولیاتی اہمیت کے حوالے سے ایک کتاب "JEHLUM -The River through My Background" لکھی، جو بہت مشہور ہوئی۔ اُن کا ایک شعر ہے۔

دور تک پت جھڑ کا موسم دیکھ کر دل رو دیا
میں نے یادوں کے دریچوں کو ابھی کھولا ہی تھا

یاسین فردوسی کی پہلی کہانی "فریب" ۱۹۷۳ء میں آفتاب میں شائع ہوئی۔ سرکاری ملازمت ڈھونڈنے کی بجائے کتب فروشی کا کام شروع کیا اور "ارمغانِ کاشمیر" کے ناشر بھی بن گئے۔ بقولِ یاسین فردوسی "جب میں خواجہ ثناء اللہ صاحب سے "ارمغانِ شباب" چھاپنے کے سلسلے میں ملا، تو انہوں نے کچھ دیر سوچ کر کہا، کہ کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس کا عنوان "ارمغانِ کاشمیر" رکھتے۔ یاسین صاحب پہلے ایسے پبلشر ہیں جنہوں نے مقامی ادیبوں کی کتابیں بڑے پیمانے پر شائع کیں۔

غلام نبی شاہدؔ کی پہلی کہانی "کتنے جھنڈے" ۱۹۷۳ء میں آفتاب میں شائع ہوئی۔ ان کی کہانیوں میں "محافظ، خودکشی، دائرے، چالیس میل کی سرنگ" پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مشتاق مہدی، یعقوب دلکش اور غلام نبی شاہدؔ کا مشترکہ افسانوی مجموعہ "مٹی کے دیئے" (۱۹۷۶ء) میں شائع ہوا، اس مجموعہ میں شاہدؔ کی چار کہانیاں شامل ہیں۔ اگر چہ بہت کم لکھتے ہیں

لیکن ہمیشہ معیاری لکھنے کو ترجیح دیتے ہیں اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے سیریل اور ڈرامے بھی لکھتے ہیں۔

انیس ہمدانی (پ: ۱۹۵۶ء ف: ۱۹۸۹ء) کی پہلی کہانی ''کشمکش'' ۱۹۷۲ء آفتاب میں شائع ہوئی۔ جواں مرگ ہونے کی وجہ سے زیادہ نہیں لکھ سکے، پھر بھی بہت سے افسانے اور ڈرامے لکھ کر دوام حاصل کیا۔ ظہور شاعر کی پہلی کہانی ''ارمانوں کا جنازہ'' ۱۹۷۲ء میں آفتاب میں شائع ہوئی ہیں جن میں ''گلشنِ ویران، وہ کون تھا، شب و روز کا تماشا، داغِ فرقت، لمحوں کے رشتے، تیرے کوچے کو جاتا ہے خیال، وہ صبح کبھی تو آئے گی'' قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔ الطاف ناوُپوری کی پہلی کہانی ''انصاف'' ۱۹۷۴ء آفتاب میں شائع ہوئی۔ رومان اور حقیقت کے امتزاج سے اچھی کہانیاں لکھیں جن میں ''کرچیاں اور آنکھیں'' قابلِ ذکر ہیں۔ مشتاق مہدی نے اگرچہ اپنے تخلیقی سفر کا آغاز ''کمینہ'' ممبئی (فلم سنسار) سے کیا ہے لیکن آفتاب میں ان کی کہانیاں چھپیں، جن میں ''یادگار، مراد، اور قاتل مسیحا'' قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ میری صاحب کا ایک افسانوی مجموعہ ''آنگن میں وہ'' منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جان محمد آزاد نے بھی آفتاب کے لئے مسلسل لکھا۔ یہاں تک کہ آزاد کا پہلا ناول ''وادیاں بلا رہی ہیں'' آفتاب میں ہی قسط وار شائع ہوا۔ آزاد نے تقریباً پانچ ناول لکھے۔ اس کے علاوہ ''آدابِ صحافت'' نامی کتاب بھی لکھی۔ ان کے جو افسانے مشہور ہوئے ان میں ''سو سال بعد، کہاں ہو تم، بُرے لوگ، ظلمات کے مسافر، قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح زاہد مختار کی ''لفظ، رنگ اور نسل'' محمد زماں آزردہ ''اور ٹاپ کر گئی'' فاروق رینزو کی ''اندھیرا'' قابل ذکر کہانیاں ہیں۔

روزنامہ ''آفتاب'' میں سینکڑوں افسانے شائع ہوئے ہیں جن پر اچھا خاصا تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ میں یہاں پر ان افسانہ نگاروں کا ذکر کرنا ناگزیر سمجھتا ہوں جن کی تحریریں پڑھکر کہا جاسکتا ہے کہ ''آفتاب کی بدولت لکھنے والوں کا ایک ایسا کارواں سامنے آیا ہے جن میں اگرچہ کچھ قلمکاری اپنا سفر جاری رکھ سکے لیکن ہم ان لکھنے والوں کو فراموش نہیں کر سکتے جنہوں نے اس دور میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس کو دیکھ کر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ دور

کشمیر میں افسانے کے حوالے سے ایک زرین دور رہا ہے۔ ان ادیبوں نے مختلف رجحانات و تحریکات سے متاثر ہو کر اپنی تخلیقی اپج کو جولانی عطا کی۔ ان میں مندرجہ ادیبوں کی کاوشیں یوں ہیں۔

عبدالرشید فراقؔ (ساحل کا تھپیڑا)، دلکش مقبول (منی کہانیاں)، رفیق اشبری (بہت دیر بعد)، بھوشن لال بھوشن (انتظار کا زخم)، نعیمہ احمد (آہوں کا قبرستان)، ثناء اللہ میر (میں آرٹسٹ ہوں)، ایم نساء (قیدی نمبر ۱۰۱)، یوسف جوزف (گونگی عدالت)، سلمٰی رعناواری (کسک)، فاروق پرا (کالی بھیڑیں)، ایم اسلم خان (افق)، محی الدین جہانگیر (میں یہی ہوں)، اشرف جان زاہد (زہریلا سیلاب)، کرن کاشمیری (ٹوٹے ستارے)، ریاض احمد ریاض (نئی عمر کی نئی فصل)، شیخ بشیر احمد (کفارہ)، نسیمہ الرشید احمد (اصلی مجرم کون؟)، محمد امین لالہ (خاموشی بولتی ہے)، محمد سلطان شاہیؔ (کون کسے قاتل ٹھہرائے)، بشارت ابن رحمان (زندگی کے خواب)، فدا حسین شال (اندھیرے اجالے)، رابعہ شاد (کرب کی صلیب)، مشتاق غازی (کل، آج اور کل)، رشید نگاہ (سہارے)، صمیم محمد یوسف (محبت یا ہوس)، امداد ساقی (وفا)، یوسف سلیم (چھایا) وغیرہ کی کہانیاں قابل ذکر کہانیاں ہیں۔

آفتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے افسانے ہی نہیں ملتے بلکہ منظومات اور مضامین بھی ملتے ہیں جن شعراء کا کلام اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہا ہے ان میں سلطان الحق شہیدیؔ، شفق سوپوری، عبداللہ خاورؔ، عبدالرحمان مخلصؔ، سجاد حسینؔ، قاسم سجاد، فیاض دلبر، فاروق آفاقؔ، ذہین علی، جاوید آذرؔ، خالد بشیرؔ، حیدر علی ہادیؔ، مشتاق مہدیؔ، بشیر گاشؔ، اوتار سنگھ چندن، سکندر یوسف، اسماعیل آشنا، قریشی جاوید، اشرف آثاری، مسعود عاصمی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مضامین میں اکثر علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان، کشمیر میں شاعری، نظم و نثر اور منٹو پر بہت سے مضامین ملتے ہیں جن ادیبوں نے مضامین لکھے ہیں ان میں پروفیسر سیف الدین سوز، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر اکبر حیدری، نشاط انصاری، ڈاکٹر برج پریمی، اوتار کرشن رہبر، ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، فاروق فیاض، عطا محمد میر، اعجاز احمد بانڈے، آخون محمد یوسف چراری، محمد رضوی، محمد ناصر، منصور احمد منصورؔ، حکیم مسعود حسین وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔

آفتاب کی ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کس طرح آفتاب نے یہاں کی نئی نسل کو پروان چڑھانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ خود خواجہ صاحب نئی نسل کو کتنا عزیز رکھتے تھے اس کا اندازہ خواجہ صاحب کے اس پیغام سے بخوبی ہوگا، جو انہوں نے ''ارمغان کاشمیر'' کے لئے لکھا تھا۔

''ارمغان کاشمیر'' ان نوعمر قلم کاروں کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب کے افق پر دلیلِ صبح کی طرح روشن ہو رہے ہیں۔ ان نوعمر قلم کاروں سے اردو ادب کا مستقبل وابستہ ہے اور ان کی موجودہ جستجو و آرزو قائم و دائم رہی، تو یہ یقینی امر ہے کہ وہ سرزمینِ کاشمیر میں اردو ادب کے آسمان کو منور کر دیں گے اور اردو ادب کو اپنی نگارشات سے مالا مال کرنے والوں میں شمار ہونگے''۔



☆...... مقبول ساحل

خواجہ صاحب... میرے اُستاد

خواجہ ثناء اللہ بٹ سے میری ملاقات عجیب حالات میں ہوئی، یہ نومبر ۱۹۸۹ء کا زمانہ تھا، ایک صبح روزنامہ ''آفتاب'' میں شائع ایک چھوٹے سے اشتہار پر نظر پڑھی، جس میں لکھا تھا کہ 'آفتاب' کو ایک معاون مدیر کی فوری ضرورت ہے، میں آفتاب سے زیادہ خواجہ صاحب میں دلچسپی رکھتا تھا کیونکہ میں نے اپنے اکثر ساتھیوں سے سن رکھا تھا کہ خواجہ صاحب اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے محض ملازم سمجھ کر کام نہیں لیتے بلکہ ان کی ہر ممکن تربیت بھی کرتے ہیں، میں نے سنا تھا کہ وہ سخت گیر اور تند مزاج شخص ہیں اور بات بات پر ڈانٹتے ہیں حتیٰ کہ جب تک کام بالکل درست نہیں ہو جاتا، وہ اپنے ماتحت کے ساتھ سختی کرتے رہتے ہیں، مجھے اس طرح کی شخصیات کے ساتھ کام کرنے میں کافی مزہ آتا تھا کیونکہ میں خود بھی پختہ کام میں ہی یقین رکھتا تھا اور 'جگاڑ بندی'' سے مجھے سخت نفرت تھی۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ قسمت آزمائی جائے، میں انٹرویو والے دن لڑکھڑاتے قدموں 'آفتاب' کے دفتر پر چلا گیا اور دیکھا کہ دروازے پر خواتین وحضرات کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی ہے اور وہ ایک ایک کر کے انٹرویو دینے جا رہے ہیں، کئی ایک ایسے بھی تھے، جن کے چہرے پر اندر جاتے وقت بہار تھی لیکن خواجہ صاحب کے کمرے سے باہر نکلتے وقت موسمِ خزاں صاف دکھائی دے رہا تھا، وجہ میری سمجھ میں صاف صاف آ رہی تھی، پندرہ بیس امیدواروں کے بعد میری باری آئی اور جب میں اندر گیا تو سامنے خواجہ صاحب کو دیکھ کر ہی عجیب سی خوشی محسوس ہوئی اور نہ جانے کیوں لگا کہ میں یہ نوکری حاصل کر کے ہی باہر نکلوں گا، انہوں نے چند سوال پوچھے، میں نے جواب دیا، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ میں اس وقت کیا کرتا ہوں؟ میں نے کہا کہ میں گریجویشن کر رہا ہوں امتحان

دے چکا ہوں، نتیجے کا انتظار ہے لیکن پارٹ ٹائم فی الحال روزنامہ ''اذان'' میں کتابت کا کام کرتا ہوں۔انہوں نے کہا ''چلو ایک اطلاعِ گمشدگی لکھو، جس میں ایک شخص کے بارے میں لکھنا ہے کہ وہ کئی روز سے گھر سے لاپتہ ہے..وغیرہ وغیرہ...'' میں نے جلدی جلدی لکھ دیا کیونکہ بطور کاتب مجھے اس طرح کے اشتہارات سے اکثر پالا پڑتا رہتا تھا، خواجہ صاحب نے پہلے میری تحریر دیکھی، اس میں کوئی غلطی نہیں پائی، اس کے بعد انہوں نے میری لکھائی دیکھی اور کہا، اگر ہم اس لڑکے کو رکھ لیتے ہیں تو ہم اس سے دو کام لے سکتے ہیں، ایڈیٹری تو کرے گا ہی، ضرورت پڑنے پر کتابت بھی کرلے گا' میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ مذاق کر رہے ہیں، کہاں خواجہ صاحب اور کہاں میں؟....لیکن وہ سچ کہہ رہے تھے، انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا ''تمہاری نوکری پکی...لیکن کام اسی وقت سے کرنا پڑے گا'' میں نے کہا ''ٹھیک ہے جناب'' اس کے بعد وہ منیجر غلام نبی سے مخاطب ہوئے ''باہر جتنے لڑکے لڑکیاں کھڑے ہیں، اُن کو جانے کے لئے کہہ دو کیونکہ مجھے وہ آدمی مل گیا ہے، جس کی مجھے تلاش تھی...''

چند دن کے بعد مجھے لگا کہ میں خواجہ صاحب کو دھیرے دھیرے سمجھنے لگا تھا لیکن یہ میری بھول تھی، وہ ایک بحرِ بیکراں تھے، ایک ایسا سمندر، جس کا کوئی کنارہ نہیں اور ایک ایسا دریا، جس کی لہروں کے سامنے بڑی بڑی چٹانیں بھی کمزور پڑ جاتی ہیں، اُن کی تربیت کا سلسلہ نہ جانے کب کا شروع ہو چکا تھا لیکن میں یہ بہت دیر بعد سمجھ پایا۔ خواجہ صاحب نے شروع میں میرے ذمے جو کام لگایا تھا، وہ تین ہی خبروں پر مشتمل تھا، اُن دنوں کویت پر صدام حسین نے حملہ کر رکھا تھا اور اس جنگ میں امریکہ بھی شامل ہو چکا تھا، اس جنگ کے حوالے سے روزانہ خبریں آتی تھیں، مجھے ٹیلی پرنٹر سے اس حوالے سے خبروں کے ٹیگ جمع کرنے اور شام کو اس کی ایک ہی خبر بنانے کی ذمہ داری تھی، خواجہ صاحب کے لکھنے اور سکھانے کا انداز بھی کافی الگ تھا، وہ کوئی بھی مضمون لکھنے سے قبل اپنے کمرے میں کافی دیر تک چہل قدمی کرتے تھے اور اس دوران کوئی اُن سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا، پھر وہ اچانک اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے اور اپنے کسی معاون کو بلا لیتے اور اُسے قلم اٹھانے کے لئے کہتے، اُن دنوں اُن کے ہاتھ کافی کمزور پڑ چکے تھے اور ہم

تین لوگ، جن میں میرے علاوہ ظہور ہاشمی اور عبدالحمید خان (بٹہ مالو) شامل تھے، اُن کے ہاتھوں کا کام کرتے تھے، وہ بولتے جاتے اور ہم لکھتے جاتے، کئی کئی بار پیراگرافوں کے پیرا گراف لکھ لکھ کر کاٹنے پڑتے، الفاظ بدلنے پڑتے اور کئی بار مضامین ہی ازسرِ نو لکھنے پڑتے لیکن کیا مجال کوئی کہے کہ خواجہ صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟... مجھے یاد ہے کہ ان کے دو مشہور کالم 'خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے' اور 'خبرِ زینہ کدل'' لکھنے سے پہلے وہ اکثر باتھ روم جایا کرتے تھے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد لکھنے بیٹھ جاتے، دفتر میں اکثر ملازمین طنزاً کہا کرتے ''خواجہ صاحب کو باتھ روم میں زبردست آئیڈیاز آتے ہیں'' دیکھا جائے تو یہ بات کافی حد تک سچ بھی تھی۔

خواجہ صاحب نے مجھے بڈشاہ فلیٹس میں آفتاب کے فلیٹ کے آدھے حصے میں رہنے کی جگہ دے دی، جہاں وادی کے مشہور خطاط مرحوم شبیر احمد بھی اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے جبکہ آفتاب کے ایک اور معاون مدیر ظہور ہاشمی بھی انہی فلیٹس میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔

خواجہ صاحب ایک جہاں دیدہ شخص تھے، اُنہوں نے تقسیمِ ریاست کے بعد کچھ دن جنگ بندی لائن کی دوسری جانب بھی گزارے تھے لیکن اپنی بے باکی اور صاف گوئی کی وجہ سے اس علاقے میں زیادہ دیر نہ ٹک سکے اور بعض راویان کے بقول ان کو وہاں سے چلے جانے کے لئے کہا گیا لیکن اکثر کا کہنا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے وہاں سے چلے آئے اور سرینگر میں اخبار شائع کر لیا، ان کے کئی قریبی اور دیرینہ ساتھیوں کا کہنا ہے کہ آفتاب شائع کرنے کے بعد خواجہ صاحب نے غریبی کے دن بھی دیکھے، ایک زمانہ ایسا بھی آیا، جب ان کے پاس اپنے عملے کی تنخواہ کے لئے بھی پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ میں نے خواجہ صاحب کے ساتھ کام کرنے والے روزنامہ ''چٹان'' کے مدیر، جن کے ساتھ میں نے بھی ایک طویل عرصہ گزارا، یعنی طاہر محی الدین کی زبانی سُنا ہے، وہ کہتے ہیں ''ایک دفعہ خواجہ صاحب کافی برے دور سے گزر رہے تھے، آفتاب کے ملازمین کو کئی ماہ سے تنخواہ نہیں ملی تھی، یہاں تک کہ اب ان میں سے اکثر ملازمین نے خواجہ صاحب کی تعظیم کرنا بھی چھوڑ دی تھی، وہ مجبور حالات میں کام تو کر رہے تھے لیکن خواجہ صاحب کو ''خواجہ'' نہیں سمجھتے تھے، جب انہیں اپنی اس حالت کا احساس ہوا تو انہوں

نے اپنے ایک دیرینہ ساتھی اور بڈشاہ نیوز ایجنسی کے مالک محمد رمضان سے مدد لی، خواجہ صاحب نے محمد رمضان کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ عملے کے سامنے خواجہ صاحب سے کچھ ادھار مانگیں، بس! چنانچہ محمد رمضان نے ایک شام خواجہ صاحب سے کہا کہ انہیں پچاس ہزار روپیہ ادھار چاہیے، خواجہ صاحب نے انکساری کا مظاہرہ کیا تو محمد رمضان نے کہا ''خواجہ صاحب! یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ ہمیشہ انکساری اور عاجزی کی حالت میں رہتے ہیں، ورنہ میں آپ کے رازوں سے اچھی طرح واقف ہوں، آپ کے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے، اب آپ چاہیں تو پچاس ہزار روپیہ آپ کے لئے کوئی بڑی بات نہیں'' روای کہتے ہیں کہ اس کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے چیک بک میں سے پچاس ہزار روپے کا ایک چیک کاٹ کر محمد رمضان کو سب کے سامنے دے دیا، یہ دیکھ کر سارے عملے کی رگوں میں جما ہوا لہو پھر سے دوڑنے لگا اور وہ اپنے اپنے کام میں لگ گئے حالانکہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ماہ بعد ان کی غربت سچ مچ دور ہوگئی اور آفتاب پر چھائے ہوئے بادل ہمیشہ کے لئے چھٹ گئے۔ اسی طرح کے اور بھی کئی واقعات روایان نے خواجہ صاحب کے ساتھ منسوب کئے ہیں، جن سے ان کی دور اندیشی اور تجربات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار خواجہ صاحب نے خلوت نشینی کا فیصلہ لیا اور گاندربل کے قریب کسی باغ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں یاد الٰہی میں مصروف ہوگئے، اس دوران آفتاب کے محض ایک دو ہی ملازمین کی ان تک رسائی تھی، ان میں سے ایک ملازم ایسا بھی تھا، جو خواجہ صاحب کو دفتر میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہ کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے سال ۱۹۹۰ء کے ماہ دسمبر میں ایک دن میں نے خواجہ صاحب کو یہ ''بری خبر'' سُنائی کہ گھر والوں نے میری شادی طے کردی ہے اور اگلے ہفتے یہ کام انجام پذیر ہونے جارہا ہے... یہ خبر خواجہ صاحب کے لئے جھٹکا تھا، ان کا ماننا تھا کہ صحافت یا پھر میڈیا کے کسی بھی شعبے میں آنے والوں کے لئے شادی بیاہ کے بندھن دسرِ راہ ہوتا ہے اور اس کام کی وجہ سے ان کا کیرئیر بری طرح سے متاثر ہوجاتا ہے، میں چونکہ پہلے ہی دور دیہات کا رہنے والا تھا اور اپنا گھر بار چھوڑ کر شہر میں رہ رہا تھا، دوئم میں نے ایک ایسا پیشہ اختیار کیا تھا، جس میں آدمی اکثر عدیم

الفرصت رہتا ہے، ان حالات میں شادی بیاہ کا بندھن مجھے نہ گھر کا رکھے گا اور نہ ہی گھاٹ کا، مجھے وہ گھڑی اب بھی یاد ہے، جب انہوں نے کہا "تمہیں دیکھ کر مجھے لگنے لگا تھا کہ ہمیں کوئی کام کا بندہ مل گیا ہے، میں اب بے فکر ہونے لگا تھا...لیکن.. یہ خبر سُنا کر تم نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا لیکن...اب دیکھنا...تم روز نت نئے بہانے لے کر میرے سامنے گھر جانے کی چھٹی مانگتے نظر آؤ گے، کبھی ماں کی بیماری کا بہانہ اور کبھی باپ کی پریشانی کا...میں یہ سب کچھ خاموش سُنتا اور ان کی باتوں کی تصدیق کرتا رہا، میں بھی جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہے ہیں لیکن میں اپنے والدین کو کیسے سمجھاتا جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے...؟

میں نے اپنی صحافتی زندگی کے اب تک کے ۲۵ برسوں میں یہ بات کئی بار قسم کھا کر کہی ہے اور ایک مرتبہ پھر دوہرانے میں مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے اگر کچھ سیکھا، وہ خواجہ صاحب سے ہی سیکھا، یہ ان کی ہمیشہ کوشش رہتی تھی کہ ان کے دفتر میں کام کرنے یا یہاں سے جانے والا کوئی بھی شخص جب کسی دوسرے دفتر (یا اخبار وغیرہ) میں کام کرے تو وہاں کوئی یہ نہ کہے کہ آپ نے خواجہ صاحب سے کیا سیکھا ہے...؟ وہ چاہتے تھے کہ دوسری جگہ جانے والا شخص خواجہ صاحب سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر جائے اور ان کی شخصیت میں سے خواجہ صاحب کی شخصیت کا کچھ حصہ نظر آئے، اس سلسلے میں ان کا طریقہ بھی کافی نرالا ہوتا تھا، مجھے یاد ہے، ایک بار وہ باہر سے آئے اور میری کرسی کے پیچھے کھڑے ہو گئے، میں تعظیماً اُٹھنے لگا تو وہ بولے "اُٹھنے کی ضرورت نہیں، بیٹھے رہو اور جو میں کہنے لگا ہوں، وہ غور سے سنو" میں خاموش رہا تو وہ بولے "یہ وہ کرسی ہے، جس پر اب تک کئی لوگ بیٹھ کر گئے ہیں اور سبھی اپنے اپنے حساب سے ٹھیک ٹھاک پوزیشنوں پر ہیں، ان میں محمد شعبان وکیل، یوسف جمیل (یوسف صاحب کو جمیلؔ کا تخلص بھی خواجہ صاحب کا ہی دیا ہوا ہے) قیصر مرزا، طاہر محی الدین اور کئی لوگ شامل ہیں...اب یہ کرسی تمہارے پاس ہے اور میں یقین سے کہوں گا کہ تم اگر چاہو بھی تو صحافت تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گی....اور اب اس کرسی کی لاج رکھنا تمہارا کام ہے" یہ کہہ کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں گم سم ان کو دیکھتا رہا....آج بھی اُن کے یہ الفاظ میرے ذہن میں کشمیر کے چشموں

کے پانی کی طرح تازہ بہ تازہ ہیں اور حق یہ ہے کہ میں نے اس پیشے میں خواجہ صاحب سے بھی زیادہ برے دن دیکھے اور کئی بار اس کو ترک کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا اور اب تو مجھے اس کام سے اس قدر محبت ہوگئی ہے کہ میں اسے دامن چھڑانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا....

جن دنوں میں خواجہ صاحب کی صحبت میں رہا، ان دنوں ان کے دوستوں میں کئی برگزیدہ افراد شامل تھے، جن کا وہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا اور ہم ان کی صحبت سے مستفید ہوتے رہتے تھے، وہ سبھی اپنے زمانے کے جانے مانے قلم کار، صحافی، بزنس مین اور اہلِ دانش تھے، مجھے ان میں سے چند ایک کے نام یاد ہیں، جن میں مرحوم پروفیسر ستار احمد شاہد، مرحوم حکیم منظور احمد، ظریف احمد ظریف، عبدالمجید خان (سابق ایس پی) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، خواجہ صاحب کے کمرے میں ان اصحاب کے ساتھ علم و دانش کے موضوعات پر بحث و مباحثے ہوتے رہتے اور ہم دوسرے کمرے میں مفت میں ان سے مستفید ہوتے رہتے۔ اس طرح سے جو کچھ بھی سیکھا وہ، اسی دوران سیکھا اور بعد کے ایام میں جس اخبار کے ساتھ بھی وابستہ ہوا، وہاں، یہاں سے سیکھا ہوا خرچ کیا، دوسری جگہوں سے جو کچھ حاصل ہوا، وہ غیر متوقع اور تلخ تجربات کا اثاثہ ہی تھا، جس نے گر کر اُٹھنے اور اُٹھ کر گرنے کے ساتھ ساتھ دھوکہ وفریب اور مکاری کا مقابلہ کرنے کا گُر سکھایا.... خواجہ صاحب کل ملا کر اپنے آپ میں ایک اعلیٰ پایے کا مدرسہ تھے، جہاں نالائق شاگرد بھی جھولیاں بھر بھر کے نکلتا تھا، اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے، حالات نے ان سے الگ کر دیا لیکن اللہ گواہ ہے میں ان کو کبھی بھی نہیں بھولا اور نہ شائد بھلا پاؤں گا، تقدیر نے جب قفس کی چار دیواری میں پہنچا دیا تو وہاں بھی خواجہ صاحب یاد رہے، میں نے اپنی کتاب ''شبستانِ وجود'' میں خواجہ صاحب کے نام ایک باب رقم کیا ہے، جس کو من وعن پیش کر رہا ہوں۔

''آج کا شاگرد دیکھ کر اپنا اُستاد یاد آیا

جب میں روزنامہ آفتاب میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کر رہا تھا۔ آفتاب میں میرے ذمے کئی کام رکھے گئے تھے۔ اس طرح متعدد نت نئی چیزیں اخبارات کی زینت بن رہی تھیں

جبکہ سگریٹ فروشی پر تو کسی حد تک پابندی لگ چکی تھی لیکن سگریٹ نوش حضرات بلیک میں سگریٹ حاصل کر کے اس لت سے چھٹکارا پانے کیلئے بالکل تیار نہ تھے۔ اس وقت میری توجہ دو موضوعات پر زیادہ لگی رہتی تھی اور اس کیلئے سارا مواد یا تو ریڈیو کی خبروں سے یا پھر انگریزی ٹیلی پرنٹر سے حاصل کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں یو این آئی اور پی ٹی آئی نے اخبارات کو جو ٹیلی پرنٹرس دے رکھے تھے اُن کے شور سے کان کے پردے پھٹ جاتے تھے لیکن خبر بہر حال مل جاتی تھی، اس کے علاوہ اردو ٹیلی پرنٹر بھی ابھی ایجاد نہ ہوا تھا لہٰذا اردو اخبارات کو انگریزی مواد کا ترجمہ کرنا پڑتا تھا۔ خواجہ صاحب کی تربیت کا طریقہ عجیب اور پراسرار تھا۔ وہ دراصل اپنے شاگرد کو کام سکھانے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی انا (Ego) کو مار ڈالنا چاہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ اگر ایک رپورٹر کو خبر حاصل کرنے کیلئے کسی جگہ دس مرتبہ جانا پڑے اور دسیوں مرتبہ اُسے حقارت کے ساتھ وہاں سے بھگا دیا جائے لیکن اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے مطلب سے گیارہویں مرتبہ بھی وہاں جائے اور اپنی انا کی پرواہ کئے بغیر اپنے مزاج کی نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے مطلوبہ نشانے کو حاصل کرے اور خالی ہاتھ آکر ایڈیٹر کے سامنے ہونے والی شرمندگی سے بچے۔ اس کے برعکس میں نے کئی بار دیکھا کہ میرے بعض رپورٹر حضرات کاغذ اور قلم ہاتھ میں اٹھا لینے کے بعد ذہنی پیچش کے شکار ہو جاتے تھے اور اکثر پریس کانفرنسوں اور مختلف مواقع پر معمولی باتوں پر ناراض ہو کر 'واک آوٹ' یا بلیک آوٹ کا نعرہ لگا کر چلے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹیلی پرنٹر کے (Tags) کو دن بھر جمع کرنے کے بعد جب میں شام کو ان کا ترجمہ کر کے لکھنے بیٹھتا تو اپنی تمام تر 'قابلیت' کو استعمال کر کے چند خبریں تیار ہوتیں اور انہیں خواجہ صاحب کے سامنے رکھ دیتا وہ کنکھیوں اور پرخشم نظروں سے میری جانب دیکھتے اور مجھے اپنی نوکری خطرے میں نظر آتی۔ معمولی اور سرسری نظر مارنے کے بعد خواجہ صاحب میری قابلیت کے ان 'نمونوں' کو مٹھی میں مسل کر کوڑے دان میں پھینک دیتے اور میں اپنا سا منہ لے کر باہر نکل آتا، یہ سلسلہ چل پڑا تو میں نے کچھ سیکھنے کی غرض سے یا پھر خواجہ صاحب کی 'ڈانٹ' سے بچنے کے لئے چند ماہ کے اندر اندر کئی ایک انگریزی اردو لغت خرید لی اور اپنی راتوں کی نیند انہیں پڑھنے میں قربان کرنے لگا لیکن

خواجہ صاحب نے اپنا سلسلہ جاری رکھا تو مجھے اپنی نوکری اور تنخواہ کے حوالے سے پریشانی لاحق ہوئی اور میں سمجھ بیٹھا تھا کہ مجھے اب نہ اب آفتاب سے نکال دیا جائے گا۔

ایک دن ہمت جٹا کر میں نے آفتاب کے دیرینہ رکن اور منیجر غلام نبی کے سامنے اپنی یہ مشکل رکھی کیونکہ میرے گھر والوں نے اسی سال دسمبر ۱۹۹۰ء میں میری شادی طے کر دی تھی اور میں اس موقعہ پر گھر والوں کی کچھ 'مالی مدد' کرنا چاہتا تھا، غلام نبی میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور آفتاب کا تازہ شمارہ میرے سامنے رکھتے ہوئے مجھے وہ خبریں دکھائیں، جو گزشتہ شام خواجہ صاحب نے مسل کر کوڑے دان میں پھینک دی تھیں۔ دراصل میرے کمرے سے باہر جاتے ہی خواجہ صاحب ان کاغذ کے پرزوں کو دوبارہ اُٹھا کر ان پر سرخی جماتے اور غیر محسوس طریقے سے کاتبوں کو دے دیتے تھے، اس طرح میری مسلسل توجہ، راتوں کی پڑھائی اور ان کی محنت اندر ہی اندر رنگ لاتی رہی اور مجھے اس کا علم بھی نہ ہوا۔ یہی نہیں، ان چند ماہ کے دوران میری تنخواہ بھی بڑھا دی گئی تھی، جس کے بارے میں، میں نے کبھی تقاضہ ہی نہیں کیا تھا۔ اب چونکہ ایک راز فاش ہو چکا تھا، خواجہ صاحب نے ایک پراسرار سلسلہ شروع کر دیا، میں اکثر آفتاب کے دفتر میں بیٹھے بیٹھے شعر و شاعری کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔ خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ براہ راست کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ میرے مد مقابل آفتاب کے ایک اور سب ایڈیٹر ظہور ہاشمی صاحب بیٹھا کرتے تھے، خواجہ صاحب جب ظہور کو کوئی نصیحت کرنا چاہتے تو وہ میری طرف متوجہ ہو کر انہیں اپنی بات میری وساطت سے پہنچاتے۔ ایک دن انہوں نے ظہور کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ شعر و شاعری میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اگر کوئی مضمون لکھتے تو زیادہ بہتر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے مضمون لکھنے کی ہدایت دی جا رہی ہے، چنانچہ اگلے روز میں گھر سے پہلا مضمون لکھ کر لایا اور اسے خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا، انہوں نے اسے پڑھے بغیر مجھے ہدایت دی کہ میں اسے کاتب شبیر احمد رضوی (مرحوم) کے حوالے کر دوں شبیر صاحب ان دنوں میرے ساتھ ہی بڈشاہ فلیٹس کے کوارٹر نمبر ۸ میں رہائش پذیر تھے۔ (ان کی سال ۹۲ء میں کینسر کی وجہ سے وفات ہو گئی، اللہ ان کو جنت الفردوس عطا کرے) شبیر صاحب نے شام کو اس مضمون کی کتابت

کی اور اگلے روز میرا آفتاب میں پہلا مضمون ''شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات'' کے عنوان سے شائع ہوگیا (یہ اکتوبر ۱۹۸۹ء کا زمانہ تھا) حسب معمول خواجہ صاحب نے مجھے اگلے روز اپنے دفتر میں بلوایا اور مضمون کے حوالے سے مختلف آڑے ترچھے سوالات پوچھے اور مجھے احساس دلایا کہ جیسے اس کی اشاعت کی وجہ سے آفتاب بند کرنے کی نوبت آگئی ہو لیکن شبیر صاحب نے دلاسہ دلاتے ہوئے کہا کہ 'لکھنا جاری رکھو اور فکر کرنا چھوڑ دو'۔ یہ تھا طریقہ اساتذہ کا اور یہ تھی قوت برداشت شاگردوں کی.... آج کل کے 'مسلح شاگرد' تو اس قدر غضبناک ہو جاتے ہیں کہ اُستاد کے قتل پر آمادہ ہو جاتے ہیں نتائج بھی واضح ہیں۔ جہاں کبھی آٹھویں جماعت تک کے تعلیم یافتہ لوگ ڈپٹی کمشنر بن جاتے تھے، وہاں آج کل پوسٹ گریجویٹ کو چپراسی کی نوکری بھی نہیں ملتی اور اب تو خاکروبوں کی بھرتی کیلئے بھی میٹرک پاس ہونا ضروری ہوگیا ہے...... اللہ رحم کرے'' (شبستانِ وجود، ایک صحافی کی سرگزشت، صفحہ نمبر ۱۴۳/ باب سوئم)

اسے میری بدنصیبی کہیے یا پھر کچھ اور کہ اسی زمانے میں کشمیر میں فلم ''زونی'' کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور اور مظفر علی اپنی پوری ٹیم کے ساتھ سرینگر کے اشبر علاقے میں ایس ایس علی کے گھر میں مقیم تھے، انہوں نے اپنا دفتر سنطور ہوٹل کے ایک کمرے میں رکھا ہوا تھا، ایک دن میں ان کا انٹرویو لینے چلا گیا، مظفر علی صاحب نے مجھے سر سے پاؤں تک ایک نظر دیکھا اور کہا ''انٹرویو کو رہنے دو میاں! میری فلم میں تمہارے لئے ایک رول ہے، تم کام کرنا چاہو گے...؟ بھلا کون بد نصیب ہوگا، جو ایسے موقعہ پر انکار کرے گا...؟ میں نے ہاں کر دی اور اُن سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، کچھ ہی دن بعد کشمیر میں حالات بے حد خراب ہوگئے اور کئی لوگوں کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا، ان میں کشمیری پنڈتوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی، مین سٹریم سیاست سے قطع تعلق کے بیانات روزانہ اخبارات کی زینت بنے ہوئے تھے، اسی دوران کسی نے مظفر علی یا پھر ان کی ٹیم میں شامل کسی شخص کو بتا دیا تھا کہ ان کی ٹیم بھی عسکریت پسندوں کے نشانے پر ہے، اس ٹیم میں جانے مانے فلم ادا کار ونود کھنہ، ڈمپل کپاڈیہ اور جیکی شروف بھی شامل تھے، مظفر علی کسی قسم کا رسک اُٹھانا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے فلم کا کام بند کر دیا اور واپس ممبئی چلے گئے لیکن اس

دوران مجھ پر فلمی بخار بری طرح چڑھ چکا تھا، میں بھی ان کے پیچھے ممبئ چلا گیا اور وہاں کے ایک ایکٹنگ سکول میں داخل ہوگیا، جہاں میں نے فوٹو گرافی، اور ایکٹنگ کے شعبوں میں سرسری تربیت حاصل کی لیکن وائے مقدر!... کشمیر کے حالات دن بہ دن خراب ہوتے چلے گئے ...... چنانچہ ممبئ چھوڑ کو واپس کشمیر چلا آیا.... اس دوران ایک بار پروفیسر ستار مرحوم نے اور چند ایک بار ظریف احمد ظریف صاحب نے کہا کہ خواجہ صاحب مجھے اکثر یاد کرتے ہیں اور بقول اُن اصحاب کے، میں پہلا خوش قسمت تھا، جس کو وہ اپنے پاس دوبارہ بلانا چاہتے ہیں، ورنہ ان کی عادت تھی کہ جو ایک بار آفتاب چھوڑ کر چلا گیا، وہ کبھی واپس نہیں آیا...... المختصر، خواجہ ثناء اللہ مرحوم ومغفور اپنی نوعیت کے واحد و یکتا شخص تھے، ایک مدرسہ، ایک انجمن اور ایک انقلاب کا نام تھا خواجہ ثناء اللہ بٹ، جنہیں لوگ ''ثناء اللہ آفتاب'' کے نام سے بھی جانتے تھے، نومبر ۲۰۰۹ء میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے، اُن کی وفات کے صرف ایک دن پہلے مجھے صورہ کے میڈیکل انسٹی چیوٹ میں ان کی عیادت کا موقعہ نصیب ہوا۔ وہ اس حالت میں بھی نہیں تھے کہ کسی کو پہچان سکتے یا کسی سے بات کر سکتے، دل میں یہ ارمان تھا کہ ان سے دو باتیں کر کے ان سے کہوں کہ کاش! میں، بدنصیب آپ کی صحبت میں کچھ اور دن رہا ہوتا. تو شاید آج میں بھی آپ کی طرح ''مثلِ آفتاب'' کسی اُفق پر چمک رہا ہوتا.... بہر حال اللہ ان کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، اور جنت الفردوس عطا کرے... آمین... وہ اس چمن میں ایک دیدہ ور سے کم نہیں تھے اور یہ شعر ان پر کتنا صادق آتا ہے کہ...

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبالؒ)

